إِنَّ وَلِيِّيَ اللّٰهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ

میرا حامی اللہ ہے جس نے اتاری کتاب اور وہ حمایت کرتا ہے نیک بندوں کی

رحمۃ اللہ علیہ

حیات شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی

تصنیف

مولانا حکیم سید محمود احمد برکاتی مدظلہ

ناشر

شاہ ابوالخیر اکاڈمی، شاہ ابوالخیر مارگ، دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یامادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com
www.KitaboSunnat.com

إِنَّ وَلِيِّيَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ

میرا حامی تو اللہ ہے جس نے اتاری کتاب اور وہ حمایت کرتا ہے نیک بندوں کی

حیات شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

تصنیف

مولانا حکیم سید محمود احمد برکاتی مدظلہ

ناشر

شاہ ابوالخیر اکاڈمی، شاہ ابوالخیر مارگ، دہلی ۶

جملہ حقوق محفوظ

کتاب کا نام : ـــــــــ حیات شاہ محمد اسحاق محدّث دہلویؒ

بارِ اوّل : ـــــــــ ۱۴۱۲ھ ، ۱۹۹۲ء

صفحات : ـــــــــ ۱۶۰

سائز : ـــــــــ ۱۸×۲۲/۸

مصنّف : ـــــــــ مولانا حکیم سید محمود احمد برکاتی

مہتمم : ـــــــــ ابوالنصر انس فاروقی (پروپرائٹر)

معاون : ـــــــــ محمد ادریس قریشی

طابع وناشر : ـــــــــ شاہ ابوالخیر اکاڈمی، شاہ ابوالخیر مارگ، ترکمان گیٹ دہلی

کتابت : ـــــــــ محمد منظور الدین ۴۶۵-مٹیا محل، دہلی ۶

تعداد : ـــــــــ ایک ہزار (۱۰۰۰)

قیمت : ـــــــــ ۲۷/- روپے

فہرست حیاتِ شاہ محمد اسحاق رح

مضمون	صفحہ

صفحہ	مضمون

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ

ابتدائیہ

حمد ہے اللہ کو ہر دم مدام　　اور نبی پر ہر زماں صد ہا سلام

عاجز ابوالحسن زید فاروقی عرض کرتا ہے کہ عاجز نے ۱۳۶۱ھ (۱۹۴۲ء) میں کتاب "القول الشیٔ فی الذّبِ عن الشیخ عبدِ الغنی" فارسی میں تالیف کی۔ اِس کتاب میں شاہ اسحاق کی طرف منسوب رسالۂ مأۃ مسائل اور رسالۂ اربعین کا ذکر آیا ہے۔ شاہ اسحاق کے صحیح حالات معلوم کرنے کی خواہش ہوئی، لیکن اس سلسلہ میں کوئی کتاب دستیاب نہیں ہوئی۔ اتفاق کی بات ہے کہ ۱۴۰۴ھ (۱۹۸۴ء) میں جناب حکیم سید محمود احمد برکاتی فرزند جناب سید حکیم محمد احمد فرزند استاذِ اَجَل علامہ اکمل مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی رحمہ اللہ سے ملاقات ہوئی اور آپ کی تالیف "حیات شاہ محمد اسحاق" کا علم عاجز کو ہوا۔ عاجز نے آپ کی کتاب کا مطالعہ کیا اور معلوم ہوا کہ بعض عنوانات تشنۂ تعبیر و بیان ہیں۔ عاجز نے برکاتی صاحب کو اس طرف متوجہ کیا۔ اللہ تعالیٰ برکاتی صاحب کو اجرِ کثیر دے کہ آپ نے اپنی اس تالیفِ قیّم پر نظر ڈالی اور ۱۴۱۲ھ (۱۹۹۱ء) میں عاجز کو درج ذیل مکتوب کے ساتھ ارسال فرمائی۔ مکتوب درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ "حیات شاہ محمد اسحاق" حضرت مولانا ابوالحسن زید فاروقی مدظلہٗ کو روانہ کر رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ یہ کتاب "حضرت شاہ ابوالخیر اکاڈمی دہلی" کی طرف سے شائع ہو۔

چہارشنبہ ۶ ربیع الآخر ۱۴۱۲ھ ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۱ء　　　محمود احمد برکاتی

آپ کی تحریر اور تالیفِ لطیف کو دیکھ کر زبان پر آیا۔

بلّٰہ الحمد آنچہ خاطر می خواست　　آخر آمد از پسِ پردہ پدید

مولوی اسماعیل کے طرفداروں نے اور نام نہاد اہلِ حدیث نے حضرت شاہ اسحاق کے متعلق غلط باتیں مشہور کی ہیں اور "مأۃ مسائل" اور "اربعین" کے متعلق بہت کچھ دسیسہ کاریاں کی ہیں جو اِس کتاب کی بدولت حرفِ غلط کی طرح رَبٹ کردہ گئی ہیں اور جاء الحق وزھق الباطل (آیا سچ اور نکل بھاگا جھوٹ) کا ظہور ہوا۔ والحمد للہ رب العالمین۔

اب عاجز اِس کتاب کو نورِ چشم و لختِ جگر ابوالنصر انس فاروقی سلمہ اللہ وجعلہ من عبادہ الصالحین کے سپرد کرتا ہے تاکہ وہ حضرت شاہ ابوالخیر اکاڈمی سے اس کو چھپوائیں۔

چہارشنبہ ۲۴ جمادی الآخرہ ۱۴۱۲ھ یکم جنوری ۱۹۹۲ء

باسمہٖ تعالیٰ

مقدمہ

الحمد للہ! آج اس خدمت سے (کسی نہ کسی پیمانے پر) فراغت حاصل ہوئی جس کو میں نے برسوں سے اپنے فرائض کی فہرست میں شامل کر رکھا تھا اور "حیات شاہ محمد اسحٰق" کی تکمیل ہوئی۔

حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنے عہد کی ایک عظیم شخصیت تھے اور خاندانِ رحیمی کے چشم و چراغ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے اور جانشین تھے۔ انہوں نے مسلسل چالیس سال درسِ حدیث دیا اور تیرھویں صدی ہجری کے صدہا خدّام حدیث ان سے مستفید ہوئے اور اس دَور کے بیش تر ممتاز و نامور علماءِ دین ان سے نسبتِ تلمّذ رکھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے ان کی پیدائش سے برسوں پہلے ان کے دائرۂ فیض کی وسعت کی پیش گوئی کی تھی۔

شاہ محمد اسحٰق کے دَور میں دینی مباحث کے بڑے بڑے معرکے ہوئے۔ دہلی اور اطرافِ دہلی کے تمام علماء دو گروہوں میں منقسم ہو گئے تھے اور باہم رسائل کے تبادلے ہو رہے تھے۔ مناظرہ کی محفلیں سجائی جا رہی تھیں مگر انہیں نانا نے جس مسندِ درس پر بٹھا دیا تھا اسی سے چپکے رہے اور اپنے کسی قول یا فعل سے مسند کے وقار کو مجروح نہیں ہونے دیا طرفین نے کیسے کیسے دباؤ ڈالے ہوں گے خود اُن کے جذبات میں کیسی کیسی طغیانیاں آئی ہوں گی، شہرت و نام وری کا لالچ بھی ان کے شیطان نے انہیں ضرور دیا ہوگا مگر انہوں نے "قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کا وِرد ترک نہیں کیا اور صحیح العقیدہ معتدل المسلک اور متوازن فکر و نظر کے علماء کی ایک جماعت ڈھالنے میں مسلسل منہمک رہے اور اس طرح ایک دیر طلب اور صبر آزما مگر مثبت تعمیری شغل میں صَرفِ قویٰ کر کے اپنے بزرگوں کے حسنِ انتخاب کی لاج رکھ لی۔

مگر شاہ مہاجر کا سا مظلوم بھی اُس دَور میں کوئی کیوں ہو گا۔ وہ جانشینِ شاہ عبدالعزیز تھے۔ مدرسہ رحیمیہ کے صدر نشین تھے۔ خاندانِ ولی اللّٰہی کے سربراہ تھے سب

سے بڑے خادمِ حدیث تھے۔ بے مثال استاد تھے۔ اَن تھک مدرس تھے۔ بجائے خود ایک مدرسہ تھے۔ مگر ان کی قدر و قیمت گھٹانے، انہیں اپنے معاصرین اور ہم چشموں سے دون مرتبہ، کم زور اور کم وزن ثابت کرنے بلکہ حتّی الامکان ان کی شخصیت سے صرفِ نظر کرنے اور انہیں "بے نام" کر دینے کی مربوط و مسلسل کوشش کی گئی۔ وہ سید احمد شہید سے عمر میں کئی سال بڑے تھے اور بعض روایات کی بنا پر تو سید احمد شہید کے استاد بھی تھے مگر اس کے برعکس بغیر کسی اصل و سند کے انہیں سید احمد شہید کے مریدین کی فہرست میں داخل کر دیا گیا۔

انہوں نے شاہ اسماعیل کے متشددانہ اور غیر معتدل مسلک سے شدید اختلافات کے باوجود تحریکِ جہاد میں سرگرم اور نمایاں اور مسلسل حصہ لیا۔ بلکہ حادثۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) کے بعد جب تحریک بالکل دم توڑ چکی تھی انہوں نے تحریک کی سربراہی کی، اسے دوبارہ زندگی دی اور ایک بار پھر میدانِ جہاد گرم کیا۔ مگر تحریک کے "متدین" مورخین نے ان کا ذکر ایک معمولی کارکن، ادنیٰ رضا کار اور زیادہ سے زیادہ امین و خازن کی حیثیت سے کیا۔ یہ ان حضرات کا طرزِ فکر و عمل تھا جو تحریکِ جہاد سے بالواسطہ یا بلاواسطہ وابستگی کے مدعی ہیں۔ رہا دوسرا گروہ۔ بدایونی و بریلوی علماء، تو وہ اس محدثِ وقت کو منافق، تحریف کار، کم علم اور معمولی ذہن و دماغ کا انسان کہنے سے نہیں چوکتے۔ یہ سزا صرف اس جرم کی دی گئی کہ شاہ محمد اسحاق نے شاہ محمد اسماعیل کی وہابیت کے رَد میں سرگرمی کیوں نہیں دکھائی؟ درس و تدریس، عالم گری اور عقائدِ حقہ کی مثبت انداز میں نشر و اشاعت کو ترک کر کے اس رد و ابطال کو اپنا مقصدِ زندگی، مشغلۂ حیات اور شعار کیوں نہیں بنا لیا؟ اُن کے مزاج میں انتہا پسندی کیوں نہیں تھی؟ سلامت روی کیوں تھی؟ اور وہ ایک معلّم کا سا استقلال اور معرکہ آرائی سے گریزاں اور ہنگامہ آرائی سے مجتنب مزاج لے کر کیوں پیدا ہوئے تھے۔

انہی نا انصافیوں اور غلط بخشیوں کا ازالہ اور شاہ صاحب کے حقیقی مقام کا تعین کرتے ہوئے اِس کتاب میں آپ مجھے پائیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ سب کچھ میں نے اپنی صلاحیت

واستطاعت کی حد تک ہی کیا ہے اس سے زیادہ کا میں مکلّف بھی نہیں ہوں۔

مجھے خوب معلوم ہے کہ علماء کے کسی گروہ کو بھی خوش نہ کر سکوں گا ہر گروہ کو مجھ سے شکوہ ہوگا۔ میں نے شاہ عبدالعزیز کی جانشینی کے سلسلہ میں شاہ اسماعیل اور شاہ اسحاق کا جو موازنہ کیا ہے اور شاہ اسماعیل کی جن کمزوریوں اور لغزشوں کی نشان دہی کی ہے ایک گروہ کے مزاج پر وہ اندازِ فکر و کلام گراں گذرے گا تو دوسرے گروہ کو مجھ سے شکوہ ہوگا کہ میں نے اس شہیدِ راہِ خدا کا ذکر ادب و احترام کے ساتھ کیوں کیا؟ ان کی تکفیر و تفسیق و تضلیل کیوں نہیں کی؟

میں ان دونوں محترم گروہوں کے سامنے اپنے اِس 'جرم' کا برملا اعتراف کرتا ہوں اعتراف کے ساتھ مجھے اس طرزِ فکر و عمل پر اصرار بھی ہے اور میں اسے فخر کے طور پر اپنا اور اپنے خاندان کا مسلکِ اعتدال کہتا ہوں۔

میرے دادا (مولانا سید برکات احمد) کے نانا (شیخ ولی محمد) شاہ اسماعیل شہید کے بھتیجے[1] اور تحریک جہاد کے السابقون الاولون میں سے تھے۔ حادثۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) کے بعد ہی بالاتفاق امیرِ جماعت منتخب ہوئے تھے۔ میری دادی (عزیز النساء بیگم ف ۱۹۴۴ء) اور میرے نانا علامہ سید مختار احمد حیدرآبادی (ف ۱۹۴۱ء) کے نانا (مولانا سید علی احمد[2] محدث بہاری) مجاہدین کے ساتھ برسوں سندھ و پنجاب کے میدانوں میں تیغ بدست رہے تھے۔ اس طرح ان غزات و شہداء کی عقیدت مجھے ورثہ میں ملی ہے۔

مگر دوسری طرف میرے پردادا (مولانا حکیم میر دائم علی عظیم آبادی) علامہ فضل حق خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ علامہ خیرآبادی رح اور شاہ شہید کے درمیان جو معرکہ رہا ہے اس سے اہلِ علم لاعلم نہیں ہیں۔ اس طرح شاہ شہید کے متشدّدانہ اور حُسنِ ادب سے بعید مسلک سے اختلاف بھی مجھے ورثہ میں ملا ہے، مگر صرف ورثہ کی بات نہیں ہے، خاندانی افکار و آراء کو یکسر محو کر کے برسوں کی حقیقت پسندانہ جستجو اور آزاد مطالعے اور طویل فکر

---

[1] شاہ اسماعیل کے حقیقی میرے بھائی شیخ محمد افضل پھلتی کے بیٹے تھے۔

[2] مولانا علی احمد، شاہ اسحاق رح کے شاگرد تھے ان کا مفصل تذکرہ تلامذۂ شاہ اسحاق کے باب میں ملاحظہ ہو۔

کے بعد اتفاقاً مجھے وہی رائے قائم کرنی پڑی جو شاہ اسحاق کی تھی، علامہ خیر آبادی کی تھی، اور میرے اسلاف کی تھی!

شاہ اسحاق خالص حنفی تھے۔ وہ عدم تقلید کے شدید مخالف تھے۔ نواب قطب الدین خاں نے بار بار لکھا ہے کہ عدم تقلید کے ذکر پر ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا تھا مگر اس اختلاف کے باوجود تحریکِ جہاد میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ علامہ فضل حق نے شاہ شہید کے افکار پر شدید تنقید کی اور سب سے پہلے کی، مگر ان کے کردار پر نکتہ چینی نہیں کی۔

مولانا حکیم میر دائم علی مسلکاً خیر آبادی ہوتے کے ساتھ بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کے خواجہ تاش یعنی حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مرید و خلیفہ تھے۔ مدرسۂ دیوبند کی مالی اعانت میں بھی حصہ لیتے تھے مگر دیوبندی اندازِ فکر سے علی الاعلان اختلاف کرتے تھے اور ریاست ٹونک میں جہاں شاہ اسماعیل کے ہم نواؤں اور ہم مسلکوں کا غلبہ تھا محافلِ میلاد کا رواج میر دائم علی کا کارنامہ ہے۔

مولانا سید برکات احمد نے شاہ اسماعیل اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے افکار پر اپنے مستقل رسائل میں شدید تنقید کی مگر ان بزرگوں کے ادب و احترام میں کوتاہی نہیں کی اور ان کے اخلاف و متقلدین سے عزیزانہ مراسم رکھے اور نیت و کردار پر حملوں سے ہمیشہ نفور اور دامن کشاں رہے۔

سید احمد شہید کے افکار میں ان بزرگوں کو کوئی جھول اور کھوٹ نظر آیا نہ کردار میں، لہٰذا ان کی ذات کو ہمیشہ ان اختلافات میں الگ رکھا گیا۔

یہی مسلک، میرا اپنا بھی مسلک ہے

ہمارے یہاں عرصے سے ہو یہ رہا ہے کہ دین و سیاست ہو یا علم و ادب زندگی کے ہر شعبہ میں خانے بنائے گئے ہیں، خطوط کھینچ کر ان خانوں کی تحدید کر لی گئی ہے اور اب ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ ان فقہی، کلامی، تاریخی، ادبی، سیاسی مکاتب میں سے کسی ایک مکتب سے کلیتاً اتفاق کرے یا کلیتاً اختلاف۔ اور ان خانوں میں سے کسی ایک خانہ میں خطوط سے بہت دور ہٹ کر دامن سمیٹ کر کھڑا ہو، اب اگر کوئی غریب اپنے دماغ سے بھی سوچنے

کا عادی ہے مسائل میں اس کی اپنی بھی رائے ہوتی ہے اور وہ تحقیق کے بغیر کوئی قول تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور کسی ایک گروہ سے عمومی اور دوامی وابستگی کو ضروری نہیں سمجھتا اور ان خانوں کی حدود کا شدت سے پابند نہیں ہے، کسی مسئلے میں خط کے اُس پار والوں سے بھی متفق ہو سکتا ہے تو وہ اِن دونوں خانوں کے "مکینوں" کی نظر میں اجنبی اور مشتبہ ٹھہرتا ہے کہ ہر مسئلے میں جماعت سے متفق کیوں نہیں ہے؟ گروہ کا صدفی صد وفادار کیوں نہیں ہے؟ دوسری جماعت اور گروہ کو شرِ محض کیوں نہیں سمجھتا؟ اس کی رائے کے ساتھ اس کی نیت میں بھی اسے کلام کیوں نہیں ہے؟ بعض مسائل میں اس سے متفق کیوں ہے؟ افکار کے ساتھ کردار پر بھی نکتہ چینی اس کے مسلک میں ناروا کیوں ہے؟ جزئیات میں اختلاف کو اہمیت کیوں نہیں دیتا؟

بہر حال اس طرزِ فکر کا حشر سمجھتے بوجھتے ہوئے اس طرزِ فکر پر مجبور ہوں اور اس پر شاکر اور مُصر بھی، اور تمام غازیانِ حق پرست اور شہدائے راہِ حق کی عقیدت میرا وسیلۂ نجات ہے۔ سید احمد شہید کے مسلک میں کوئی کجی نہیں۔ شاہ اسماعیل کا اندازِ فکر غیر متوازن تھا۔ شاہ اسحاق نے شاہ اسماعیل کے جہاد "بالمسلمین" اور تبلیغ عدم تقلید سے شدید اور برملا اختلاف کیا مگر دعوتِ جہاد پر لبیک کہنے میں ان اختلافات کو سدِ راہ نہیں ہونے دیا اور مجاہدین کی بیش از بیش رہنمائی فرمائی۔ پیشِ نظر کتاب میں شاہ محمد اسحاق کے سلسلہ میں ایک نادر مخطوطہ بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ وہ سند ہے کہ جو شاہ صاحب کے شیخ حرم عمر بن عبدالکریم نے ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۶ء میں انہیں عطا فرمائی تھی۔ یہ سند نہ صرف یہ کہ آج تک طبع نہیں ہوئی بلکہ کسی کتب خانہ میں اس کے کسی مخطوطہ کا بھی مجھے علم نہیں ہے، یہ نادر مخطوطہ ہمارے کتب خانہ (برکات اکادمی) کی زینت ہے۔

اس سے بھی زیادہ قیمتی اور نادر مخطوطہ رسالہ شعب الایمان ہے۔ یہ رسالہ خود حضرت شاہ اسحاق کی تالیف ہے مگر نہ صرف یہ کہ یہ نادر الوجود ہے بلکہ اس کا ذکر اور نام بھی آج تک کسی تحریر میں نظر سے نہیں گذرا۔ یہ مخطوطہ ہمارے عزیز دوست جناب عارف حجازی ایم۔ اے نے مجھے عطا فرمایا ہے جس کے لئے میں سراپا سپاس ہوں۔

طالب علم

برکات اکادمی، لیاقت آباد ۷ کراچی ۱۹ — ۱۹۷۲ء — حکیم محمود احمد برکاتی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی (فرزند و جانشین شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی) کی تین صاحبزادیاں تھیں۔ ان میں سے ایک شیخ محمد افضل سے بیاہی گئی تھیں۔

محمد افضل افسوس ہے کہ شیخ محمد افضل کے مفصّل حالات ہمیں معلوم نہ ہو سکے۔ مولوی سیّد عبدالحئی نے ان کا سلسلۂ نسب یوں تحریر کیا ہے[1] "محمد افضل بن احمد بن اسماعیل بن منصور بن احمد بن محمود[2] بن قوام الدین عمری دہلوی"۔ اور شیخ عمر بن عبدالکریم بن عبدالرسول مکی نے اپنے اجازہ بنام شاہ محمد اسحاق میں انہیں مولانا محمد افضل اور مولوی احمد اللہ آنامی نے انہیں "محدّث لاہوری" لکھا ہے۔ اس سے ان کے عالم دین محدّث اور وطناً لاہوری ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

انہی مولانا محمد افضل محدّث لاہوری کی پُشت اور شاہ عبدالعزیز کی دخترِ والا کے بطن سے وہ محدّثِ جلیل پیدا ہوئے جو شاہ محمد اسحاق محدّث دہلوی کے اسمِ گرامی اور ابوسلیمان کی کنیّت اور بڑے میاں کے عرف سے متعارف ہیں۔

ولادت آپ کی ولادت ذی الحجہ ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۲ء کو دہلی میں ہوئی۔

تحصیلِ علوم آپ نے کافیہ تک ابتدائی کتابیں اپنے خالو اور اپنے ماموں مولوی عبدالحی بڈھانوی سے پڑھیں، باقی درسیات کی تکمیل شاہ عبدالقادر (۱۸۱۴ء) سے کی۔ سندِ حدیث اپنے نانا شاہ عبدالعزیز سے حاصل کی، پھر ۴۳ سال کی عمر میں شیخ عمر بن عبدالکریم بن عبدالرسول مکی سے مسلسلات کی سند حاصل کی۔

شاہ محمد اسحاق کے نصابِ درس کی تفاصیل اگرچہ منضبط نہیں ہے مگر خاندانِ رحیمی کا نصابِ درس معروف و معلوم ہے۔ شاہ ولی اللہ نے الجزء اللطیف میں اپنا نصابِ درس

---

[1] نزہۃ الخواطر الجزء السابع ص۵۱ طبع دکن ۱۹۵۹ء۔

[2] مولوی عبدالوہاب دہلوی نے النفحۃ الدہلویہ (مقدمۃ المسوّیٰ الجزء الاول) ص۱ طبع مکہ معظمہ ۱۳۵۱ھ میں محمد کے بجائے محمود لکھا ہے۔

اِس طرح درج کیا ہے :-

حدیث مشکوٰۃ : صحیح البخاری (تاکتاب الطہارت)

تفسیر بیضاوی (کچھ حصّہ) : مدارک کچھ حصّہ۔

فقہ : شرح وقایہ ، ہدایہ

اصولِ فقہ : حُسّامی توضیح وتلویح

منطق : شرح شمسیہ (قطبی) شرح مطالع (کچھ حصّہ)

کلام : شرح عقائد مع خیالی ، شرح مواقف

سلوک : عوارف ، رسائل نقشبندیہ

حقائق : شرح رباعیاتِ جامی ، لوائح ، مقدمۂ نقد النصوص

خواص اسماء و آیات : شاہ عبدالرحیم کا مؤلفہ رسالہ

طب : موجز القانون

حکمت : شرح ہدایت الحکمۃ وغیرہ

نحو : کافیہ و شرح ملاجامی

معانی : مطول ۔ مختصر المعانی

ہندسہ و حساب : چند رسال مختصرہ

لیکن یہ فہرست صرف ان کتابوں کی ہے جو انہوں نے اپنے والد شاہ عبدالرحیم سے پڑھی تھیں۔ حدیث کی تکمیل انہوں نے شیخ محمد افضل سرہندی اور حجاز میں شیخ ابوطاہر مدنی وغیرہ سے کی اور جن جن کتابوں کی قرأت و سماعت کی ، اُن کی تفصیل الارشاد الیٰ مہمات الاسناد اور "رسالہ شیخ سنبل معروف بہ اوائل" وغیرہ میں درج ہے۔ آخر میں ان کی نظر میں امام مالک کی موطا کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ اس طرح تفسیر جلالین کی افادیت بھی واضح ہو گئی تھی۔ چنانچہ اپنے وصیت نامہ میں ان کی تدریس کی وصیت بھی کی ہے[1]۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے وصال

---

[1] الرسالۃ الوضیہ فی النصیحۃ والوصیۃ طبع مطبع احمدی ، سری رام پور مٹ۔

سے صرف تین سال قبل ۱۱۶۳ھ میں شیخ جاراللہ بن عبدالرحیم میں اہلِ پنجاب کو جو اجازہ دیا تھا اس میں الجزء اللطیف میں مذکورہ نصاب سے حسب ذیل کتب زیادہ ہیں:۔

(۱) جلالین (سورۂ یونس سے سورۂ کہف تک) (۲) صحیح مسلم (۳) سنن ابی داؤد۔ (۴) جامع ترمذی (۵) سُنَنِ نسائی (۶) سنن ابن ماجہ (۷) سنن دارمی (۸) مسند امام احمد۔ (۹) شمائل ترمذی (۱۰) الحصن الحصین (۱۱) نخبۃ الفکر (۱۲) شرح نخبۃ الفکر (۱۳) کتاب الامم للشیخ ابراہیم کردی (۱۴) عوارف المعارف (۱۵) احیاء العلوم۔

نیز اپنی حسب ذیل مؤلفات بھی درج کی ہیں:۔

(۱) المسوّٰی (شرح موطا) (۲) الحجۃ البالغہ (۳) الانصاف (۴) عقد الجید (۵) القول الجمیل (۶) مسلسلات (۷) النخبیہ فی سلسلۃ الصحبہ (۸) الفوز الکبیر اور ان آٹھ کے بعد بھی "وغیر ذالک من کتبی" تحریر کیا ہے۔

یہ صرف حدیث، اصولِ حدیث، تفسیر اور تصوّف کی کتابوں کا ذکر تھا۔ دوسرے فنون وکتب میں ترمیم واضافہ کی شدید ضرورت تھی۔ کیونکہ مندرجہ بالا نصابِ تعلیم بہت نامکمل[۵۱]، ناقص اور ترمیم طلب تھا۔ کئی فنون سرے سے غائب تھے۔ مثلاً صرف، ادب، اصولِ تفسیر، تاریخ، الٰہیات وغیرہ اور داخلِ نصاب فنون میں بھی کتابوں کی تعداد بہت مختصر اور ناکافی تھی۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ خاندانِ رحیمی کا نصابِ درس بہت جلد تبدیل ہوگیا۔ اور تفسیر، حدیث، کلام، تصوّف وغیرہ میں نہ صرف شاہ ولی اللہ کی کتابیں داخلِ نصاب کی گئیں بلکہ دوسری مفید کتب کا بھی اضافہ کیا گیا۔ مثلاً سلوک وتصوّف کی کتابوں کے متعلق شاہ عبدالعزیز کا ایک ملفوظ ہے[۵۲]:

ارشاد شد کہ طور درس ہر علم ایں جا جدا بود۔ چنانچہ بیان فرمود وارشاد ساخت کہ طور درس تصوّف بایں طور می کنانیدم کہ یعنی اوّل

ارشاد ہوا کہ ہر علم کے درس کا طور یہاں (خاندانِ رحیمی میں) مختلف ہے چنانچہ فرمایا کہ درس تصوّف کا یہ طریقہ ہے پہلے میزان

---

۵۱ اس کے برعکس انہی کے معاصر ملا نظام الدین فرنگی محلی ف ۱۱۶۱ھ نے لکھنؤ میں جو نصاب مرتب ورائج کیا تھا وہ نسبتاً زیادہ حاوی وجامع تھا۔ ۵۲ ملفوظات شاہ عبدالعزیز مطبع مجتبائی میرٹھ سنہ ۱۳۱۴ھ ص ۲۵

لوائح بجائے میزان بعدہ لمعات و شرح لمعات بعدہٗ درۂ فاخرہ تصنیف شاگرد محی الدین تونوں بعدہٗ فصوص بعدہٗ فتوح الغیب۔	کے بجائے لوائح اس کے بعد لمعات اور شرح لمعات اس کے بعد درۂ فاخرہ جو محی الدین تونوی کے شاگرد کی تصنیف ہے اس کے بعد فصوص اس کے بعد فتوح الغیب پڑھائی جاتی ہیں۔

اس طرح فنون کی کتب میں بھی مزید اضافہ قرینِ قیاس ہے۔ ہم ابناء و احفاد شاہ ولی اللہ کی "فنون" میں مہارت کا بار بار ذکر سنتے ہیں۔ مثلاً شاہ رفیع الدین کی ریاضیات میں مہارت کے متعلق شاہ عبد العزیز کے کئی ملفوظ ہیں یہ جو شاہ عبد العزیز نے معقولات میں ہدایت الحکمۃ اور زواہد ثلاثہ کے حواشی لکھے تھے، تو یہ مہارت چند رسائلِ مختصرہ کی تعلیم سے تو پیدا نہیں ہوئی ہوگی یقیناً عقلیات کے متون و شروح درس و مطالعہ میں رہے ہوں گے۔

ملفوظات شاہ عبد العزیز ہی سے ایک اور قابلِ ذکر و قدر اضافہ کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اضافہ ہے عبرانی زبان اور تورات و انجیل کی تعلیم۔ راوی لکھتا ہے کہ شاہ صاحب نے فرمایا[1]:

فاضلے از اکابر علما آمدہ از و تحقیق توریت بلسان عبری می کردم چنانچہ چند آیات او مع ترجمہ ارشاد فرمود۔	اکابر علماء میں سے ایک فاضل (بیرونِ ہند سے) آئے میں نے ان سے عبرانی زبان میں توریت پڑھی چنانچہ توریت کی چند آیات ترجمہ کے ساتھ سنائیں۔

اس کے بعد راوی نے وہ آیات بھی نقل کی ہیں اور اناجیل کے متعلق شاہ صاحب کی رائے بھی نقل کی ہے[2]۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترمیم صرف شاہ عبد العزیز کی ذات تک محدود اور انہی کے ساتھ مخصوص نہیں رہی تھی بلکہ اس کو نصابِ درس کی ایک مستقل ترمیم کے طور پر قبول کر لیا گیا تھا۔ اور اناجیل کی تعلیم مدرسۂ رحیمیہ کے نصاب کا ایک لازمی جز بنا دی گئی تھی۔ چنانچہ خود

---

[1] ملفوظات صفحہ ۶۲ و ۶۳۔ [2] ملفوظات صفحہ ۷۴۔

[3] ایک فتوے میں بھی شاہ صاحب نے اناجیل کا حوالہ دیا ہے:

در اناجیل اربعہ یوحنا و متی و غیرہا پانزدہ صد آسیب و جن را اخراج آں از بدن بدم عیسوی مذکور است صفحہ ۱۱۱ فتاوی عزیزی مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۹ء	یوحنا اور متی وغیرہ کی اناجیل اربعہ میں آسیب و جن کے انسانی بدن میں حلول کر جاتے اور دمِ عیسوی سے ان کے خارج ہونے کے پندرہ سو قصے مذکور ہیں۔

شاہ محمد اسحاق صاحب کا جن کے نصابِ تعلیم کی وضاحت کے لئے ہم نے یہ طول کلام کیا ہے بیان ہے کہ[1]

ہمارے خاندان کا قاعدہ ہے کہ وہ تفسیر سے پہلے تورات وانجیل وزبور پڑھا دیا کرتے تھے کیوں کہ بغیر اِن کتابوں کے پڑھے قرآن شریف کا لطف نہیں آتا، اسی قاعدے کے مطابق مجھے بھی یہ کتابیں پڑھائی گئیں اور اس لئے میں عیسائی مذہب سے ناواقف نہیں ہوں۔

مدرسۂ رحیمیہ کے نصابِ درس میں غیر مختتم سلسلہ اصلاح وترمیم کی ہی ایک کڑی ہے۔ شاہ عبدالعزیز کا وہ فتوائے جواز ہے جو انہوں نے انگریزی زبان کے حصول کے لئے دیا تھا۔ اور انگریزی پڑھنا یعنی انگریزوں وتعلیم انگریزی یعنی آئینِ خط وکتابت ولغت اصطلاح اینہا را دانستن باکے ندارد (خط وکتابت زبان اور اصطلاحات کا جاننا بے ضرر ہے)۔

مگر یہ اجازت غیر مشروط نہیں ہے بلکہ بہ نیت مباح باشد (نیت نیک ہو)

و اگر بمجرد خوش آمد آنہا واختلاط با آنہا تعلیم ایں لغت نماید وبایں وسیلہ پیش آنہا تقرب جوید۔ البتہ حرمت وکراہت دارد۔

اور اگر صرف انگریزوں کی خوشامد اوران سے میل جول بڑھانے کے لئے کوئی یہ زبان سیکھنا چاہے اور اس طرح انگریزوں کا تقرب مطلوب ہو تو یقیناً اس میں حرمت وکراہت ہے۔

ایک اور فتوے میں بھی یہ بات کہی ہے کہ[2]

تعلیم لغت وخط ایشاں بنا بر تشبہ البتہ ممنوع اما بنا بر اطلاع مضامین ایشان یا خواندن خطوط ایشاں اگر تعلم لغت کند مضائقہ ندارد۔

تشبہ کی نیت سے تو انگریزی میں نوشت و خواند کا سیکھنا ممنوع ہے۔ مگر ان کے خیالات وافکار سے باخبر رہنے یا ان کے خطوط کو سمجھ لینے کی غرض سے کوئی انگریزی زبان سیکھنا چاہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علمائے دین حمایتِ حق اور دفاعِ باطل میں ہمیشہ چاق چوبند

[1] ارداحِ ثلاثہ ص۱۱۳ یونین پریس دہلی۔ [2] فتاویٰ ص۱۱۰

رہے ہیں اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے تمام مفید و معقول اسلحہ سے مسلح رہیں۔ چنانچہ ان تمام فنون اور السنہ کی تحصیل میں انھوں نے سرگرمی کا مظاہرہ کیا جن کا بالواسطہ یا بلا واسطہ قریب یا بعید، منفی یا مثبت تعلق دینیات سے ہو۔ جنوبی ہند سے بڑھ کر جب فرنگی تاجروں کی حکومت کا دائرہ شمالی ہند تک وسیع ہونے لگا اور نصرانی مبلغین و دُعاۃ کی سرگرمیاں عالم گیری دلی کے گلی کوچوں میں بھی نظر آنے لگیں تو ناممکن تھا کہ دینِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم) کے پرجوش انصار صرف قرآن و سنت کے احکام کی تشریح و تفسیر پر ہی اکتفا کئے رہتے یا صرف فلاسفۂ یونان و روما کے ہفوات واباطیل کے رد و ابطال ہی میں اپنی توانائیاں کھپاتے رہتے اور نئے زمانے کے نئے وسائل اختیار نہ فرماتے، نئے سوالات کے نئے جوابات نہ فراہم کرتے، نئے اعداء سے مقابلہ کے لئے نئے اسلحہ نہ سجاتے۔ آپ نے دیکھ ہی لیا کہ ان بزرگوں نے نہ قدیم السنہ سے وابستہ رہنے پر اصرار کیا، نہ قدیم علوم کی تعلیم و تعلم پر انحصار روا رکھا۔ عبرانی زبان سیکھی[1]، انگریزی کو جائز قرار دیا، اردو[2] کو رائج ہوتے دیکھا تو اس کو ذریعۂ اظہار و ابلاغ بنا یا اور اس طرح نصابِ درس کو جامع تر بناتے چلے گئے اور آئندہ کے لئے بھی ہر نوع کی مفید و مستحسن تبدیلیوں کا باب وا کر دیا۔

گفتگو طویل ہوگئی۔ سوال یہ تھا کہ شاہ محمد اسحاق کا نصابِ تعلیم کیا ہوگا؟ تفاصیل منضبط

---

[1] علوم جدیدہ کی تحصیل اور وسعتِ معلومات میں متصل اجتہاد کے سلسلہ میں ارواحِ ثلاثہ میں جو روایات بیان کی گئی ہیں چاہے سننے والوں کو کیسی ہی عجیب کیوں نہ معلوم ہوں، ان کو انہونی ثابت نہیں کر سکیں گے۔ روایت یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز کے پاس ایک انگریز جہاز راں آیا اور کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کو ہر فن میں دخل ہے۔ جہاز رانی کے فن میں بھی آپ کو دخل ہے۔ شاہ صاحب نے جو بعض پرزوں کے حالات بیان کئے تو اس کو بھی یاد نہ تھے۔ متحیر دیکھ کر فرمایا کہ بچپن میں اس فن کی ایک کتاب دیکھی تھی اس سے ہی کچھ یاد رہ گیا تھا۔ ص۱۴۷

[2] شاہ عبدالعزیز نے شاہ ولی اللہ کے حکم سے خواجہ میر درد سے اردو سیکھی تھی، کیونکہ جس طرح حصولِ حدیث و اصول فقہ فن ہے اصول زبان بھی فن ہے۔ شاہ عبدالقادر نے خواجہ صاحب سے خصوصی استفادہ کیا تھا (لال قلعہ کی ایک جھلک، خواجہ ناصر نذیر فراق) شاہ ولی اللہ کے چچا شاہ ابوالرضا محمد ۱۰۱۱ھ اور شاہ عبدالاحد و حضرت شاہ گل کی باہمی مراسلت کو شاہ ولی اللہ نے انفاس العارفین میں نقل کر دیا ہے۔ اس میں شاہ ابوالرضا کے خطوط میں پانچ ہندی (اردو) دوہرے (دوہے۔ دوبیتی) اور شاہ گل کے خطوط میں چار دوہرے ہیں۔ شاہ ابوالرضا کی اہلیہ شاہ گل کی عزیزہ تھیں۔ شاہ گل، شاہ سعد اللہ گلشن کے استاد تھے اور وہ ولی دکنی یا گجراتی کے استاد تھے۔

نہیں تھیں اس لئے خاندانِ رحیمی کے نصابِ درس کا جائزہ لے کر اس خلا کو پُر کیا گیا۔

شاہ محمد اسحاق اس وقت پیدا ہوئے جب شاہ عبدالقادر ۲۹/۳۰ برس کے اور شاہ عبدالعزیز ۳۷/۳۸ برس کے ہو چکے تھے اور جب ابتدائی مراحلِ تعلیم طے کر کے وسطانی مراحل میں پہنچے تو یہ دونوں بھائی چالیس اور پچاس سے متجاوز ہو چکے تھے اور تعلیم و تدریس اور درس و افادہ میں ایک عمر صرف کرنے کی وجہ سے ان کے افکار و آرا میں پختگی اور گہرائی پیدا ہو گئی تھی۔ یقیناً انہوں نے اپنے اس محبوب نواسے کو وہ تمام کتابیں پڑھائی ہوں گی جن کو انہوں نے داخلِ درس کیا ہوگا۔ وہ کتابیں بھی پڑھائی ہوں گی جو عام طور پر نہیں پڑھاتے ہوں گے اور جو منظورِ نظر اور خصوصیات کے حامل طلبہ کو پڑھائی جاتی ہیں۔

تربیتِ باطن

شاہ عبدالعزیز کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اور شاہ اسحاق نواسوں میں سب سے بڑے تھے اس لئے وہ انہیں بہت چاہتے تھے اور بیٹے کی طرح سمجھتے تھے اور ان کی پرورش اپنے ہی گھر میں کر رہے تھے۔ اس لئے علومِ ظاہر سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تربیتِ باطن کا بھی یقیناً خصوصی اہتمام فرماتے ہوں گے۔ شاہ اسحاق فطرتاً و خلقاً سعید و صالح تھے، ستھرا اور مصفیٰ دینی و اخلاقی ماحول ملا۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز جیسے یگانۂ روزگار مربی و مزکی ملے۔ سوچا جا سکتا ہے کہ دینے والوں نے دینے میں کیا کمی کی ہوگی اور لینے والے نے لینے میں کیا کوتاہی کی ہوگی۔ دینے والوں کی دریا دلی بہت کچھ بلکہ سب کچھ دے کر بھی مطمئن نہیں ہوئی ہوگی اور لینے والے کی جوع و طلب ہر جرعہ پر دو چند ہو جاتی ہوگی۔

روایت ہے کہ[1] شاہ عبدالعزیز صاحب نے شاہ عبدالقادر صاحب سے فرمایا کہ میاں عبدالقادر! اسحاق کی طرف توجہ کرو نا۔ اس کا جواب شاہ عبدالقادر صاحب نے یہ دیا کہ حضرت! اسحاق کو ضرورت نہیں ہے، وہ بلا ذکر و شغل بوجہ اپنی ریاضت ہی کے ان لوگوں سے بڑھا ہوا ہے جو باقاعدہ سلوک طے کرتے ہیں۔ غرض شاہ صاحب نے چند مرتبہ فرمایا مگر شاہ عبدالقادر صاحب نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا۔

---

[1] ارواحِ ثلٰثہ ص۱۱۱

منشی محمد جعفر تھانیسری (ف ۱۹۰۵ء) نے سوانح احمدی میں شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب کی سید احمد شہید سے بیعت کا ذکر کیا ہے (ص۸۴) اور دوسری جگہ ان دونوں بھائیوں کو سید صاحب کے خلفاء میں محسوب کیا ہے (ص۲۹۸)۔ ہمیں اس کی صحت میں کلام ہے۔ منشی جعفر غلط بیانی اور تاریخ کو مسخ کرنے کا عادی ہے۔ اس نے سید صاحب کے مکاتیب کی عبارات میں انگریزوں کی خاطر خود ترامیم کیں اور واقعات کے غلط نتائج اخذ کئے پھر وہ معاصر مؤرخ بھی نہیں ہے بلکہ حادثۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) کے ایک سال بعد تو اس کی ولادت ہوئی تھی۔ پھر انیسویں صدی کے آخری عشرے میں اس نے منظورہ وقائع احمدی اور وصایائے وزیری کی مدد سے اپنی کتاب ترتیب دی اس لئے ۱۸۲۴ء سے پہلے واقعہ کے سلسلہ میں اس کا قول بغیر سند و حوالہ کے کیونکر قبول کیا جاسکتا ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ اسحاق و شاہ یعقوب تو کیا چیز ہیں وہ تو شاہ عبدالعزیز کو ہی سید صاحب سے بیعت کے مشتاق و محتاج بتایا ہے اور لکھتا ہے [۱]

جب سید صاحب حج کو تشریف لے گئے اس وقت شاہ عبدالعزیز کو سید صاحب کے علوِ مرتبت کا حال غیب سے معلوم ہوا اس وقت مولانا شاہ عبدالعزیز ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ سید صاحب کی واپسی کے بعد میں ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے وہ شرف جس کا وعدہ ہے ضرور حاصل کروں گا مگر افسوس ہے کہ مولانا کی امید بر نہ آئی، کیونکہ سید صاحب کے دوبارہ دہلی آنے سے پہلے مولانا کا وصال ہو گیا تھا۔

اس سے بھی زیادہ پُر لطف غلط بیانی یہ ہے کہ شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ کو بھی سید صاحب کا مرید اور خلیفہ بناتا ہے (ص۱۵۵ و ص۲۰۰) حالانکہ شاہ عبدالغنی کا وصال ۱۲۰۳ھ میں ہو گیا تھا۔ جبکہ سید صاحب تین برس کے تھے۔

منشی جعفر کے برعکس میاں جی محمدی نے سید صاحب کو شاہ اسحاق کا شاگرد بتایا ہے [۲]۔ اور یہ بعید بھی نہیں ہے کیونکہ سید صاحب شاہ صاحب سے چار سال چھوٹے تھے۔ امیر شاہ خاں

---

[۱] حیات سید احمد شہید (سوانح احمدی) طبع کراچی ۱۹۰۸ء ص۱۲۱۔ یہی بات مولوی سید عبدالحیؒ نے مولانا رشید احمد گنگوہی سے منسوب کی ہے کہ میں یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے پیر شاہ عبدالعزیز سے بڑھ کر ہیں ص۱۳۵ دہلی اور اس کے اطراف۔ [۲] ارواحِ ثلٰثہ ص۱۵۶۔

کا بیان ہے کہ میرے استاد میاں جی محمدیؒ صاحب فرماتے تھے کہ میں نے مولانا محمد اسحاق سے کافیہ شروع کیا تھا (کذا) اور سید صاحب جب تشریف لائے تو انہوں نے شاہ اسحاق صاحب سے میزان شروع کی اور اتنی جلدی ترقی کی کہ ...... نصف سے آگے مجھے کافیہ میں پکڑ لیا۔ اور کافیہ ہی پڑھتے ہوئے انہوں نے مشکوٰۃ بھی شاہ صاحب سے شروع کر دی۔

مولانا ابوالحسن علیؒ ندوی نے بھی غالباً منشی جعفری پر اعتماد کر کے لکھ دیا ہے کہ شاہ اسحٰق و شاہ یعقوب نے سید صاحب سے استفادہ و باطنی تعلیم حاصل کی[1]۔ مگر ظاہر ہے کہ بے سند قول کا چاہے وہ ثقہ بزرگ کا ہو کوئی اعتبار نہیں۔

عبدالرحیم ضیاء نے بیان[2] کیا ہے کہ شاہ محمد اسحاق شاہ عبدالعزیز سے طریقہ قادریہ میں بیعت تھے۔

درس

قدیم درس گاہی نظام کا یہ دستور تھا کہ طلبہ کی تحصیلِ علوم سے رسمی فراغت کے بعد ابتدائی درجوں کے اسباق اُن کے سپرد کر دیئے جاتے تھے اور اس کو بھی تحصیل کی ایک شکل اور تعلم کی ایک منزل تصوّر کیا جاتا تھا۔ اس دستور کی رُوح یہ تھی کہ اس طرح معلومات میں رسوخ اور پختگی ہو جاتی تھی اور حصولِ علم کے ولولہ میں اگر کوئی کمی تھی تو وہ پوری ہو جاتی تھی اور کتاب کے جو جو مقامات قابلِ حل رہ گئے تھے وہ اب مزید محنت و توجہ سے حل ہو جائیں۔ جہاں شکوک رہ گئے تھے وہ دفع ہو جائیں۔ رہی سہی جو خامی ہو وہ طلبہ کے سوالات اور گرفتوں سے پوری ہو جائے۔

مدرسہ رحیمیہ میں بھی یہ نظام جاری تھا۔ چنانچہ شاہ اسحاق کو بھی فراغت کے فوراً بعد تعلیم و تدریس کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ وہ ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں جب فارغ ہوئے تو شاہ عبدالعزیز تقریباً ساٹھ سال کے ہو چکے تھے اس لئے وہ اپنے خاندان کے نوجوانوں کو تدریس کی تربیت سے فارغ کر دینا چاہتے تھے۔ شاہ اسحاق سے پہلے شاہ اسماعیل اور شاہ مخصوص اللہ کو تدریس کے فرائض سپرد کیے جا چکے تھے۔ اب شاہ اسحاق کو یہ ذمہ داری سونپی گئی اور وہ مدرسہ رحیمیہ کے مدرسین میں شامل ہو گئے۔

---

[1] سیرت سید احمد شہید۔ [2] مقالاتِ طریقت۔

اِس کے کچھ ہی مدت کے بعد شاہ عبدالعزیز پر ضعف اور امراض و عوارض کا اتنا غلبہ ہو گیا کہ وہ تدریس کی ذمہ داریوں سے دست کش ہو گئے اور مدرسین کی صدارت شاہ رفیع الدین کے سپرد ہوئی۔

سرسید لکھتے ہیں[۵]: "چونکہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم و مغفور بہ سبب کبر سنی اور ضعف مزاج و کثرتِ امراض، دماغِ تعلیم و تدریسِ طلبہ نہ رکھتے تھے۔ سلسلہ تدریس کا حضرت کی ذات (شاہ رفیع الدین) بابرکات سے جاری تھا"

جب شاہ رفیع الدین ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء میں رحلت فرما گئے تو صدارت کا بار شاہ اسحاق کے دوش پر آپڑا۔ پھر اسی دَور میں شاہ اسماعیل کی تمام تر سرگرمیاں دعوتِ جہاد کے لئے وقف ہو کر رہ گئی تھیں۔ اور وہ تدریس سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ اس لئے شاہ اسحاق کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں اور وہ صبح کی نماز سے عشاء کی نماز تک اور طعام کے وقفوں کو چھوڑ کر مسلسل مصروف رہتے تھے۔

۱۲۳۸ھ میں ایک "خاں صاحب عالی مراتب" نے حضرت شاہ عبدالعزیز کو ایک مکتوب میں شاہ صاحب کی مصروفیت اور معذوری کے پیشِ نظر یہ لکھ دیا تھا کہ خطوط کے جوابات لکھنے پر مولوی رشید الدین خاں یا شاہ اسحاق کو مامور کر دیں۔ شاہ صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا ہے[۵۲]۔

وانچہ مرقوم بود کہ مولوی رشید الدین صاحب یا مولوی محمد اسحاق را باید گفت کہ ایشاں بتحریر جواب پردازند۔ ایں ہر دو صاحبان بسیار قلیل الفرصت اند و بہ سبب درس و دیگر امور اصلاً یکدم فرصت ندارند لہٰذا بتدریج ایں ہر دو حضرات را خواہد گفت۔

اور یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ مولوی رشید الدین خاں یا مولوی محمد اسحاق سے کہا جائے کہ خطوط کے جوابات دیا کریں تو یہ دونوں صاحبان بہت مصروف ہیں اور درس اور دوسرے فرائض کی وجہ سے یک لمحہ کی انہیں فرصت نہیں ملتی پھر بھی بتدریج ان دونوں صاحبان کو یہ کام سپرد کیا جائے گا۔

---

[۵] آثار الصنادید طبع کراچی ص۳۶۶۔ [۵۲] فتاویٰ عزیزی مجتبائی ص۱۱۔

عنفوانِ شباب سے اس مشقِ تدریس اور مسندِ درس کے ساتھ منسلک ہو جانے کا یہ نتیجہ ہے کہ شاہ اسحاق سے تلامذہ کی ایک کثیر تعداد نے استفادہ کیا۔ انہوں نے مسلسل پچاس سال درس دیا اور ہزاروں علماء نے ان سے فیض حاصل کیا۔ ہم ان تلامذہ کے بیان کے لئے الگ فصل قائم کریں گے۔

تدریس میں انہماک اور صرف توجہ کے سبب ہی وہ تصنیف و تالیف کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔

ابتدائے عمر سے مسلسل تدریس کے مشغلہ ہی کا یہ ثمرۂ خاص بھی تھا کہ ان کا مزاج بھی مدرسانہ اور معلّمانہ بن گیا تھا، خطیبانہ اور داعیانہ نہیں۔ معلّم کا مزاج خطیب، داعی اور مصلح کے مزاج سے مختلف ہوتا ہے۔ مدرس کا معاملہ ہوتا ہے طلبہ سے، جو اس کے ایک ایک لفظ کو تولتے اور ایک ایک بات کو پرکھتے ہیں اور اس سے ہر دعوے کی دلیل طلب کرتے ہیں۔ اِس لئے درس گاہ میں ایک ایک لفظ سوچ سوچ کر، تول تول کر بولا جاتا ہے۔ خطیب کو واسطہ ہوتا ہے عوام سے جن کی اصلاح کے جذبہ سے وہ اپنی بات کو زور دار بیان کرتا ہے۔ معمولی بات کو اہم بتاتا ہے۔ چھوٹی موٹی اور اخلاقی کمزوری کو بھی مہلک بتاتا ہے۔ ذمائمِ اخلاق کے ازالہ اور حسناتِ اعمال کی ترغیب کے لئے مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ خطیب کا اندازِ بیان پُرزور اور لہجہ پُرجوش ہوتا ہے۔

انسان برسوں ایک ہی طرز پر سوچتے سوچتے اور ایک ہی انداز سے بولتے بولتے اور مسلسل ایک خاص طبقہ کو خطاب کرتے رہنے سے اس طرزِ فکر و اندازِ بیان کا عادی ہو جاتا ہے اور تواتر و تسلسل کو مزاج کی تقویم میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ معلّم کا مزاج محققانہ اور احتیاط پسندانہ ہوتا ہے۔ خطیب و داعی کے مزاج میں مبالغہ آرائی اور گرم نوائی ہوتی ہے۔ وہ ریاضی کی زبان میں بات کرتا ہے یہ شاعری کی۔ ہم ایک مستقل فصل میں شاہ اسحاق کے مزاج و مسلک پر اپنا نتیجۂ فکر و مطالعہ پیش کریں گے۔ وہاں ان کے مدرسانہ اور غیر خطیبانہ اندازِ فکر کے مظاہر پر روشنی ڈالیں گے۔

وعظ و تذکیر

شاہ عبدالعزیزؒ کے معمولات میں سے خواص و طلبہ کو درس و افادہ کی طرح عوام مسلمین کو مواعظ وخطبات کے ذریعہ ہدایت و رہنمائی بھی تھی۔ سرسید نے لکھا ہے:[1]

"ہفتہ میں دو بار مجلسِ وعظ منعقد ہوتی تھی اور شائقین صادق العقیدت وصافی نہاد خواص و عوام مورد ملخ سے زیادہ جمع ہوتے تھے اور طریقہ رشد و ہدایت کا استفادہ کرتے تھے۔"

مولانا سندھی نے ہفتہ کے دنوں اور مقام کی تعیین بھی کی ہے:[2]

"ہفتہ میں دوبار منگل اور جمعہ کو دہلی کوچہ چیلان کے پرانے مدرسے میں مجلسِ وعظ منعقد ہوتی تھی۔" مولوی بشیرالدین لکھتے ہیں۔ "(شاہ صاحب کے یہاں) ہفتہ میں دو بار مجلسِ وعظ منعقد ہوتی تھی جس میں کثرت سے سامعین جمع ہوتے تھے کہ تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی تھی۔"

(واقعاتِ دارالحکومت دہلی دفعہ ۳ ص ۵۸۷)

یہ غالباً عام مجالسِ وعظ کا ذکر ہے کیونکہ ۱۲۳۸ھ کے ایک مکتوب میں خود شاہ عبدالعزیز نے تحریر فرمایا ہے کہ:[3]

"درتمام سال درخانۂ فقیر دو مجلس منعقد می شوند مجلسِ ذکر وفات شریف و مجلسِ شہادت حسین اول کہ روز عاشورہ یا یک دو روز بیشتر ازیں قریب چہار صد کس یا پنج صد کس بلکہ ہزار فراہم می آیند و درود می خوانند بعد ازاں کہ فقیر می آید و می شنید۔"

ہمارے خیال میں حضرت شاہ صاحب نے ان دو سالانہ مجالس کا ذکر کسی خصوصیت کی بنا پر فرمایا ہے۔ ہو سکتا ہے مقامِ اجتماع کے اختلاف کی وجہ سے جیسا کہ "درخانۂ فقیر" سے گمان ہوتا ہے یا موضوع کی تخصیص کی وجہ سے کہ منگل اور جمعہ کی مجالس کا کوئی موضوع مخصوص نہ ہوتا ہو، اور ان دو مجالس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال اور سیدنا حسین و حسن رضی اللہ عنہما کی شہادت کا بیان ہوتا تھا۔

---

[1] آثار الصنادید طبع کراچی ص ۲۴۹
[2] مجموعہ حالات و کراماتِ عزیزی ص ۲۳
[3] فتاویٰ عزیزی مطبع مجتبائی ص ۱۱۱/۱۱۱

نواب مبارک علی خاںؒ کا بیان ہے کہ ان مواعظ کی پابندی کا حضرت کو اتنا اہتمام تھا کہ جب حضرت مولانا صاحب کا اس جہانِ فانی سے انتقال ہوتا ہے۔ کئی دن سے کچھ نہ کھایا تھا اور مرض کی شدت تھی۔ وعظ کا دن آیا تو حضرت نے فرمایا۔ مجھ کو پکڑے رہیو جب بیان کرنے لگوں تب چھوڑ دیجیو۔ ایسا ہی کیا پھر بدستور وعظ فرمانے لگے۔ ہزاروں آدمی جمع ہوئے۔ آواز اشخاصِ قریب کے کان میں جتنی پہنچتی تھی اسی قدر اشخاصِ بعید کے کان میں پہنچتی تھی۔ جو عالم و فاضل سمجھتا تھا اسی قدر جاہل سمجھتا تھا۔

انہی نواب صاحب نے شاہ اجنہؒ کی طرف سے دو جنوں کے تعین پر مشتمل ایک واقعہ بھی درج کیا ہے جو "بروز جمعہ و منگل جناب مولانا صاحب کا وعظ سن کر رات کو بادشاہ کے سامنے بیان کرتے ہیں۔" [۵۲]

حضرت شاہ اسحاق نے حضرت شاہ عبدالعزیز کی حیات میں ہی یہ سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ابتداءً وہ آغازِ وعظ میں تلاوتِ قرآنِ کریم اور قرأتِ احادیث کیا کرتے تھے۔ پھر وعظ میں بھی شاہ محدث کا ساتھ دینے لگے۔ شاہ محدث کے وصال کے بعد شاہ اسحاق نے یہ سلسلہ منقطع نہیں ہونے دیا اور پابندی کے ساتھ عوام کو خطاب فرماتے رہے اور عوام ذوق و شوق کے ساتھ اُن کے مواعظ میں آتے اور مستفید ہوتے رہے۔

عبدالرحیم ضیا لکھتے ہیں: "چوتھے دن اپنے استاد کی پیروی اور خلق کی رہنمائی کے لئے مجلسِ وعظ منعقد فرماتے ہیں۔" [۵۳]

سرسید کا بیان ہے کہ [۵۴]

"میں شاہ اسحاق صاحب کے وعظ میں حاضر ہوتا تھا۔ باہر مردوں کا ہجوم ہے، زنانے میں عورتیں جمع ہیں۔ نہ ڈولیوں کا شمار ہوتا نہ پالکیوں کا۔ شاہی محلات تک کی بیگمات آئیں۔ امراء کے یہاں سے کھانے کی دیگیں پک کر آئیں جو طلبہ اور عوام میں تقسیم ہو جائیں۔ خود شاہ صاحب معمولی چپاتی اور شوربہ گاڑھے کے دسترخوانوں پر رکھ کر کھاتے۔"

اپنے افادت کدے میں خطابات کے علاوہ شاہ صاحب دوسرے مقامات پر بھی

---

۱۵ مجموعہ حالات کرامات عزیزی۔ [۵۲] ایضاً ص ۱۵۔ [۵۳] مقالات طریقت ص ۲۲۵۔ [۵۴] آثار الصنادید۔

پند و نصیحت کے لئے بلائے جاتے تھے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا بیان ہے کہ[1]

مولانا محمد اسحاق صاحب عشرۂ محرم کے دن بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے بادشاہ[2] چونکہ سونے کے کڑے پہنے تھا آستین سے بند کر لیا اور جب تک مولانا بیٹھے رہے مؤدب بیٹھا رہا۔ اس مجلس میں سر الشہادتین پڑھی جاتی تھی۔ ایک خادم نے عرض کیا کہ اگلے بادشاہ درویش ہوا کرتے تھے۔ فرمایا بادشاہ دراصل وہی ہے جو گدا ہو۔ گدا بادشاہ ست و نام شہ گدا۔

شاہ صاحب کے انہی مواعظ کے مواقع پر معتقدین کے اجتماع سے فائدہ اٹھا کر تحریکِ جہاد کے لئے اعانتیں بھی حاصل کر لی جاتی تھیں۔ مہر صاحب لکھتے ہیں:[3]

"شاہ اسحاق وعظ فرماتے تو مولوی نصیر الدین مدرسہ کے دروازہ پر فراہمی زرِ اعانت میں مصروف رہتے۔"

افتاء

مدرسہ رحیمیہ صرف دہلی نہیں پورے برصغیر کا ایک مرجعِ خواص و عوام مرکز تھا۔ اس ادارہ میں جہاں ملک کے گوشے گوشے سے ہزاروں طالبانِ علم آ آ کر حصولِ علم کی سعادت حاصل کرتے وہاں حاضری سے معذور علماء اپنی علمی مشکلات خط و کتابت کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے تھے اور صدرِ وقت اور سربراہِ عہد اپنے جوابات سے اُن کی اُلجھنیں دُور کرتے۔ عوام دینی و فقہی مسائل دریافت کرتے اور یہاں سے فتوے دیئے جاتے۔

شاہ عبدالعزیزؒ کی حیات ہی میں شاہ رفیع الدین کے وصال کے (۱۲۳۳ھ) بعد ہی علمی سوالات اور استفتا شاہ اسحاق کے ذمہ کر دیئے گئے تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے بعد تو یہ ذمہ داری تمام تر شاہ اسحاق پر آ پڑی تھی۔ چنانچہ میاں نذیر حسین اپنا مشاہدہ لکھتے ہیں کہ[4]

---

[1] شمائمِ امدادیہ صفحہ ۱۲۰۔ [2] شاہ اسحاق کے عہد میں اکبر شاہ ثانی حکمران تھے ان کے بعد ۱۸۳۷ء میں سراج الدین ظفر کو لال قلعہ کی بادشاہی سپرد ہوئی تھی۔ مقالاتِ طریقت میں ہے کہ دسویں کو نہیں نویں کو یہ بیان ہوتا تھا۔ ایک روز بیشتر بہادر شاہ یا کوئی وزیر یا شہزادہ دعوت کے واسطے حاضر ہوتا تھا اور بروز شنبہ سواریاں آتیں مع خدام و حشم تشریف فرما ہوتے مجلس عام ہوتی تو جو چاہتا چلا جاتا صفحہ ۲۲۳۔ [3] سرگزشت مجاہدین صفحہ ۱۳۶۔ [4] الحیات بعد الممات صفحہ ۴۹۔

تدریس اور فتاویٰ نگاری سے آپ کو فرصت نہ ملتی تھی۔ فتاویٰ کی کثرت اپنی مصروفیات نیز طلبہ کی تربیت کے خیال سے آپ پہلے استفتا طلبہ کے سپرد فرما دیا کرتے تھے کہ وہ اس کا جواب مرتب کرلیں۔

میاں نذیر حسین صاحب فرماتے ہیں:[1]

دریں ازمنہ کثیرہ صدہا فتاویٰ اتفاق تحریر روداد۔ جناب مولانا مرحوم بنا بر امتحان و نیز کارگذاری مستفیتان سوالہائے سپرت می فرمودند برائے تحریر جوابات۔

(اپنی طالب علمی کی) اس طویل مدت میں مجھے صدہا فتاویٰ لکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور جناب مولانا مرحوم ہم طلبہ کے امتحان کی خاطر اور فتوے طلب کرنے والوں کا کام نکلنے کی غرض سے سوالات میرے سپرد کرکے جواباً لکھنے کا حکم دیتے تھے۔

مولانا محمد محسن ترہتی نے بھی اسی قسم کی بات کہی ہے:[2]

اخبرنا بعض المشائخ انہ کان فی اصحابہ رجال سوء وکان ھو یحسن الظن بہم فاذا رُفِعَتْ الیہ مسئلۃ رفعہا الی من حضر منہم فربما کانوا یدسّون فی جوابہا بعض ما یوافق اھوائہم۔

ہمیں بعض بزرگوں نے بتایا کہ شاہ صاحب کے طلبہ میں بعض غلط قسم کے لوگ بھی تھے اور شاہ صاحب (اپنی سادگی کی بنا پر) ان کے ساتھ حسنِ ظن رکھتے تھے۔ چنانچہ جب آپ کے پاس کوئی استفتا آتا تو وہ (غلط قسم کے لوگوں میں سے) کسی ایک کے سپرد فرما دیتے اور یہ لوگ عموماً ان فتاویٰ میں (اپنے مسلک کے مطابق) اپنی مرضی کے جواب لکھ دیتے تھے۔

امامت

میاں نذیر حسین صاحب کا بیان ہے کہ شاہ عبدالعزیزؒ نے شاہ اسحاق کو اپنے یہاں کی امامتِ صلوٰۃ بھی مفوض کردی تھی اور اس سلسلہ میں انہوں نے ایک واقعہ بھی تحریر کیا ہے،[3] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب امامت کے لئے عمامہ کا اہتمام نہیں فرماتے تھے۔ ایک افغانی مصلی نے اس پر شاہ عبدالعزیزؒ سے اعتراض کیا انہوں نے بات ٹال دی۔ چند روز بعد

---

[1] الحیات بعد الممات ص۴۹۔ [2] الیانع الجنی: ص۷۷۔ [3] حیات بعد الممات ص۴۷ [4] مقالات طریقت ص۱۲۱۔

افغانی مصلی نے پھر اعتراض کیا تو شاہ عبدالعزیز کو جلال آگیا اور انہوں نے فرمایا کہ ابھی تک وہ (شاہ اسحاق) بغیر عمامہ کے نماز پڑھاتا ہے۔ اب میں اس سے کہوں گا کہ بغیر ٹوپی کے نماز پڑھائے۔ شاہ عبدالعزیز کا وصال ہوا تو ان کی نماز جنازہ بھی شاہ اسحاق نے ہی پڑھائی تھی۔[1]

اور (شاہ عبدالعزیز) صبح کو جو ایک رکوع قرآن شریف کا قریب طلوعِ آفتاب کے ہر روز ایک تفسیر کے ساتھ سنا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بروزِ وفات سنا ہے تو اس کے قاری خاص مولانا اسحاق صاحب ہوتے تھے۔ ص۲۸ مقالاتِ طریقت۔ خود شاہ اسحاق کا بیان بہ روایت ملا عبدالقیوم نقل کیا ہے کہ میں صبح کو قرآن شریف کا رکوع پڑھا کرتا تھا۔ اس میں لوگ سامع ہوتے تھے۔ ص۲۸

اخیر درس ان کا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى کا تھا وہاں سے حضرت (شاہ عبدالعزیز) نے شروع کیا اور حضرت کا آخری درس آیۃ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰكُمْ کا تھا۔ "حضرت کے بعد وہاں سے مولانا محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے شروع کیا۔" (مقالاتِ طریقت ص۲۸)

جانشین شاہ عبدالعزیزؒ

شاہ محمد اسحاق تقریباً ۲۰/۲۲ سال کی عمر میں (۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء) تحصیلِ علوم سے فارغ ہو گئے تو اُس وقت شاہ عبدالعزیز ۶۰ سال کے ہو چکے تھے اور وہ متنوع امراضِ مزمنہ میں مبتلا ہونے اور مطالعہ، درس و تذکیر اور تصنیف و تالیف میں غیر معتدل صرف قویٰ کی بنا پر عمر سے زیادہ ضعیف ہو گئے تھے اور انہیں درس و افتاء اور وعظ وغیرہ میں ایک معاون کی ضرورت ہو گی اور وہ یہ معاون اپنے ہی گھرانے کی نئی نسل میں سے کسی کو بنانا چاہتے ہوں گے تاکہ اس کو مسلسل تربیت دے کر اس قابل بنا سکیں کہ ان کے بعد وہ مدرسہ رحیمیہ کا صدر نشین، تحریک ولی اللٰہی کا سربراہ، خود اُن کے علوم و کمالات کا وارث اور افکار و نظریات کا ترجمان اور راز داں بن سکے۔[2]

شاہ عبدالعزیز کی یہ خواہش فطری تھی۔ اُن کو ابتدا ہی سے ایسے حالات سے سابقہ

[1] مقالاتِ طریقت ص۱۳۔ [2] ملاحظہ ہو ہماری کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، (طبع لاہور ۱۹۷۶ء)

رہا کہ اپنے جانشین کے انتخاب اور اس کی تربیت کی فکر انہیں ہونی ہی چاہیئے تھی۔

شاہ ولی اللہ نے اپنے وصال کے بعد (۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) وقت پانچ صاحبزادے چھوڑے تھے۔ سب سے بڑے شیخ محمد تھے جو اس وقت تخمیناً ۲۶ سال کے تھے۔ فارغ التحصیل بھی ہو گئے تھے۔ مگر اول تو وہ اپنے ننہال پھلت میں رہتے تھے۔ ثانیاً اُن پر جذب بھی غالب تھا۔ باقی چار صاحبزادوں میں سب سے بڑے خود شاہ عبدالعزیز تھے جو اس وقت سولہ ۱۶ سال کے تھے۔ باقی تین صاحبزادے شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی بہ ترتیب ۱۲-۸-۴ سال کے تھے۔ خود شاہ عبدالعزیز ابھی تعلیم سے فارغ نہیں ہوئے تھے۔ دوسرے بھائیوں کا تو ذکر ہی کیا اور سن ہی کیا تھا؟ چچا (شاہ اہل اللہ) اور ماموں (شاہ محمد عاشق) مستقلاً پھلت میں متوطن تھے۔ ان حالات میں مدرسہ اور تحریک کو آباد اور زندہ رکھنے میں سب ہی رحیمیوں نے حسب توفیق و استطاعت حصہ لیا ہوگا مگر شاہ عبدالعزیز نے عنفوانِ شباب میں پیرانہ پختہ کاری کا جو نمونہ پیش کیا وہ چشمِ تاریخ کو کبھی کبھار دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ انہوں نے باپ اور دادا کی اُجڑی ہوئی مسند کو دوبارہ رونق اور زینت دی۔ اور یہ تحریک تاریخ ماضی کے کسی ورق میں گوشہ نشین ہونے کے بجائے پھر حال کی وسعتوں پر چھا گئی۔

لیکن انہوں نے ابھی آغازِ سفر کیا ہی تھا کہ "سلسلہ ولی اللہی" کو ایک اور افتاد سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۱۸۷ھ کا سال سلسلے کے لئے عام الحزن بن کر آیا اور کئی اساطینِ حلقہ اور اراکینِ سلسلہ مختصر وقفوں کے ساتھ اس ایک سال میں رحلت کر گئے۔ شاہ اہل اللہ، شاہ محمد عاشق، خواجہ محمد امین ولی اللہی، شیخ نور اللہ اور خواجہ محمد سعید۔ اس المیہ کا رنگ یوں اور گہرا ہو گیا کہ شاہ ولی اللہ کے تلامذہ کی تعداد یوں ہی بہت کم تھی اس لئے ان حضرات کی وفات سے شاہ عبدالعزیز گویا تنہا رہ گئے۔ وہ خود ابھی (۱۱۸۷ھ میں) ۲۶ سال کے تھے۔ بڑے بھائی مجذوب تھے۔ اور چھوٹے تینوں بھائیوں میں صرف شاہ رفیع الدین تعلیم سے ابھی ابھی فارغ ہوئے تھے باقی دو زیرِ تعلیم تھے۔ مگر اس نوعمری اور تنہائی کے باوصف شاہ عبدالعزیز نے بڑے استقلال و جواں مردی، بلند ہمتی، جوش و ہوش اور انہماک کے ساتھ مدرسے اور سلسلے کے نظام کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ کام کو آگے بڑھایا۔ لیٹی ہوئی بساط پھر جمائی۔ بھائیوں کی تعلیم و تربیت سے

عہدہ برآ ہوئے۔ تلامذہ کا حلقہ پیدا کیا۔ مسترشدین کی ایک تعداد کو فیض یاب کیا۔ معاندین سے متصادم ہوئے۔ معاصرین میں مقام پیدا کیا۔ مختصر یہ کہ مسلسل و پیہم ذہنی و جسمانی مشقت اور جاں کاہی سے وہ خلا پُر کیا جو شاہ ولی اللہ کی وفات سے پیدا ہوا تھا۔ اور وہ کمی پوری کر دی جو بزرگانِ سلسلہ کی با جماعت رحلت سے پیدا ہو سکتی تھی۔

مگر اس مسلسل و پیہم مشقت و جاں کاہی کا نتیجہ و ثمرہ وہ امراض و عوارض تھے جنہوں نے
انہیں وقت سے پہلے "معمّر" اور سن رسیدہ، ضعیف اور نقیہ (کمزور) بنا دیا تھا۔

یہ امراض و عوارض بھی ان کی رفتار کو سست نہ کر سکے اور وہ بڑی تیزی سے مقامات طے کر رہے تھے کہ حوادث کا پھر ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور بزرگانِ سلسلہ کی جدائی کے ٹھیک بیس[۲] سال کے بعد اب یارانِ سلسلہ اور رفقاءِ تحریک کی مفارقت کا آغاز ہو گیا۔ بھائیوں نے داغِ مفارقت دینا شروع کر دیا۔ ۱۲۰۸ھ میں شیخ محمد (بڑے بھائی) نے وفات پائی۔ ... ۱۲۲۷ھ میں شاہ عبدالغنی نے، ۱۲۳۰ھ میں شاہ عبدالقادر نے، ۱۲۳۳ھ میں شاہ رفیع الدین نے وفات پائی۔

اس صورتِ حالات میں شاہ عبدالعزیز کو اس بات کے صرف تصوّر سے وحشت ہوتی ہوگی کہ حلقہ اور سلسلہ ایک بار پھر معرضِ خطر میں پڑ جائے۔ یا پھر مدرسے اور سلسلے کی سربراہی کے لئے پہلے کی طرح جستجو اور تگ و دو کرنی پڑے، یا جس کے کاندھوں پر صدارت و قیادت کا بار ڈالا جائے اسے ان کی طرح صحت کا ایثار کرنا پڑے اس لئے ان کی یہ خواہش و کوشش ہوگی کہ اپنے خاندان سے چند اُبھرتے ہوئے نوجوانوں کو اس مقصد کے لئے انتخاب کر کے تربیت دیں اور دورانِ تربیت ہی یہ تجربہ اور فیصلہ بھی کر لیں کہ اِس منتخب جماعت میں کون اس بارِ عظیم کو اُٹھانے کی ہمت اور صلاحیت زیادہ رکھتا ہے؟ ظاہر ہے کہ بزمِ رحیمی کی صدارت اور شاہ عبدالعزیز کی خلافت کے لئے کم سے کم یہ اوصاف لازمی تھے۔ وہ اپنے اسلاف جیسا باوقار، حلیم، نرم خو، سخت کوش اور جفاکش ہو۔ اس کی طالب علمانہ اٹھان یہ بتاتی ہو کہ وہ مستقبل میں مدرسہ رحیمیہ کی مسندِ صدارت پر سج سکے گا۔ اس میں سیاسی سُوجھ بُوجھ اتنی ہو کہ دارالخلافۂ ہند دلّی کے ایک معروف علمی گھرانے اور مختلف النوع

مسائلِ اختلافیہ کے سلسلے میں مرجعِ خواص و عوام مرکزِ افتا کی نازک ذمہ داریوں کا احساس رکھتا ہو۔ جو اِن تمام صفات و خصائص کا حامل ہو جو ایک مرشدِ طریقت، فقیہِ باطن، مزکی، مربی اور طبیبِ روحانی میں ہونی چاہئیں۔ جس کے خیالات میں توازن و اعتدال، دل میں سوز و درد کا آتش فشاں زبان میں قند و نبات کی سی گھلاوٹ ہو، جسے تکفیرِ مسلمین کے شوق کے بجائے تکثیرِ مسلمین کا ولولہ ہو، جسے "فصل کردن" کی مشق نہیں "وصل کردن" کی تڑپ ہو، جو بیک وقت مولوی بھی ہو اور صوفی بھی۔

مختصر یہ کہ جو مستقبل میں ثانی شاہ عبدالعزیز بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور صدارت و قیادت کا با قاعدہ اہل ہو۔ ان اوصاف و شرائط کے پیشِ نظر وہ اپنے خاندان کے نوخیزوں کا شروع ہی سے اِس نگاہ سے جائزہ لیتے رہے ہوں گے۔

خود اُن کے نرینہ اولاد تو کوئی تھی ہی نہیں۔ تین صاحبزادیوں میں سے ایک صاحبزادی کے بطن سے دو صاحبزادے تھے۔ (۱) شاہ محمد اسحاق (۲) شاہ محمد یعقوب۔

چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدین کو اللہ نے چھ صاحبزادے دیئے تھے۔ (۱) مولوی مخصوص اللہ (۲) مولوی محمد موسیٰ (۳) مولوی محمد عیسیٰ (۴) مولوی محمد حسن (۵) محمد حسین (۶) عبدالرحمٰن عرف مصطفیٰ۔

ان سے چھوٹے بھائی عبدالقادر کے بھی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اُن کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنی کے صرف ایک صاحبزادے شاہ محمد اسماعیل تھے۔

ایک عم زاد بھائی شاہ مُقرّب اللہ (ابن شاہ اہل اللہ) کے ایک فرزند تھے معظم اللہ۔ دوسرے عم زاد بھائی [1] (ابن شاہ اہل اللہ) کے دو صاحبزادے تھے۔ (۱) مولوی محمد یوسف (۲) مولوی محمد عثمان۔

مگر ان میں سے جو حضرات مستقلاً پھلت میں رہتے تھے اور وہاں کے قیام سے ان کی معاش وابستہ تھی جیسے معظم اللہ، مولوی محمد یوسف، مولوی محمد عثمان۔ ان کے انتخاب کا سوال ہی نہ تھا۔

---

[1] نام معلوم نہ ہوسکا۔

اب رہ گئے وہ نوخیز افرادِ خاندان جو دلّی میں متوطن اور براہِ راست شاہ عبدالعزیز کے زیرِ نگاہ تھے یعنی شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالغنی کے صاحبزادگان، تو ان میں سے (۱) محمد عیسیٰ (۲) محمد حسن (۳) محمد حسین (۴) عبدالرحمٰن عرف مصطفٰے[۱] کے متعلق ہمیں نہیں معلوم کہ ان میں کس کس کو حصولِ علم کی توفیق ملی تھی۔ کس کس نے حصولِ علم کو منزلِ آخر تک پہنچایا تھا؟ کس دل و دماغ کے تھے، کردار و عمل میں کیا مقام رکھتے تھے؟ مختصر یہ کہ معلوم نہیں یہ حضرات اس قابل تھے یا نہیں کہ شاہ محدّث کی نگاہ انتخاب ان پر پڑتی؟ اس لئے اب صرف پانچ حضرات رہ جاتے ہیں۔ (۱) شاہ مخصوص اللہ (۲) شاہ محمد موسیٰ (۳) شاہ محمد اسماعیل (۴) شاہ محمد اسحاق (۵) شاہ محمد یعقوب۔ ان میں شاہ مخصوص اللہ شاہ محمد موسیٰ، شاہ محمد یعقوب کے متعلق اگرچہ یہ معلوم ہے کہ وہ عالم تھے، حسنِ عمل میں بھی اپنے خانوادۂ گرامی کی روایات کے حامل تھے لیکن انہیں علوم میں کوئی بلند مقام اور مخصوص مرتبہ حاصل نہیں تھا۔ دل و دماغ کی صلاحیتیں بھی غیر معمولی نہیں تھیں اور بہ حیثیت مجموعی ان شرائط کو پورا نہیں کرتے تھے جو ہم بیان کر چکے ہیں۔

لامحالہ شاہ محدّث کا رجحان اس گروہ کے باقی دو حضرات کی طرف ہونا چاہیے تھا۔ (۱) شاہ محمد اسماعیل (۲) شاہ محمد اسحاق۔ روایات و آثار سے اسی قیاس کی تائید ہوتی ہے کہ شاہ صاحب نے قُبیلِ آخر انتخاب انہیں دو نوجوانوں کا کیا تھا اور فرمایا کرتے تھے[۲] اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمَاعِیْلَ وَاِسْحٰقَ۔

مگر شاہ اسماعیل اپنی افتادِ مزاج اور اپنے کلامی اور فقہی مسلک کے لحاظ سے اپنے عمِ گرامی سے اس قدر مختلف تھے کہ شاہ محدث کا اپنی خلافت کے لیے ان کا انتخاب کر لینا خود اپنے افکار و نظریات کی تردید کے مترادف ہوتا۔ جس چمن کو انہوں نے اپنی نوجوانی کے گرم خون سے سینچ کر شاداب کیا تھا اور جس نوع کے گل ولالہ کی پرورش کر کے اس کی زینت بڑھائی تھی اس کو ایک ایسے باغبان کے سپرد کیسے کر سکتے تھے جو اُن سرو سمن کا دشمن

---

[۱] مصطفٰے کے متعلق نواب شیفتہ نے گلشن بے خار میں لکھا ہے کہ "از علم بہرہ ندارد"۔ الحیات بعد الممات کے مولف کا بیان ہے، علم کی دست گاہ ان میں بہت کم تھی۔ ص۲۹۔ [۲] سوانح احمدی از مولوی محمد علی رائے بریلوی۔

تھا جو جانِ چمن تھے اور جس سے بجا طور پر یہ اندیشہ تھا کہ وہ کئی تختوں کی وضع تبدیل کر دیگا۔ کئی کیاریوں کا جغرافیہ بدل دے گا۔ خاص انہیں شاخوں کو تراش دے گا جو پھولوں سے لدی ہوئی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ محمد اسماعیل جیّد عالم تھے۔ ان کے ذہن میں حدت تھی، حافظہ قوی تھا، علوم مستحضر تھے۔ دماغ نکتہ رس تھا۔ بلند کردار اور متقی تھے اور اُن کی پوری زندگی اخیار و صلحا کی سی زندگی تھی اور اپنی جان تو انہوں نے اسی شان سے جاں آفریں کے سپرد کی اور اسی ذوق و شوق سے لیلائے شہادت کو لبّیک کہا کہ ہر مومن کے دل سے آواز آتی ہے۔

یہ نصیب، اللہ اکبر، لوٹنے کی جائے ہے

مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اُن میں کئی کمزوریاں بھی تھیں۔ اُن کے مزاج میں اشتعال تھا۔ وہ بہت جلد گرم ہو جاتے تھے اور

"بعض اوقات غصّہ میں بے قابو ہو جاتے تھے۔" [1]

سیّد صاحب تک کو ایک بار مجبور ہو کر کہنا پڑا کہ [2]

"آپ کا غصّہ بڑھ رہا ہے اِس کو دور کرنا چاہیئے۔"

وہ گفتگو میں نہیں تحریر میں وہ الفاظ استعمال کر گذرتے تھے کہ ثقاہت و شائستگی عرق عرق ہو جائے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ [3]

"فرج سائِی زنان ناقصات العقل والدین و تعلیم و تعلم کتاب الحیض والنفاس"

ایک صاحب کے متعلق لکھتے ہیں۔ [4]

فانہٗ رجل مخبط العقل مختل الحواس غبی جاھل ... فانہٗ فی الحقیقۃ نائب للدجال

.... فانہٗ رجل سامری۔

تشدد و تصلّب اور شرکِ خفی کو شرکِ جلی کہہ گذرنے کا خود انہوں نے اعتراف کر لیا تھا۔ [5]

---

[1] غلام رسول مہر جماعت مجاہدین ص۱۸۵
[2] ایضاً ص۱۱۵
[3] مکاتیب شاہ اسماعیل شہید
[4] مکاتیب شاہ اسماعیل شہید۔ مطبع مجتبائی ۱۸۹۲ء
[5] جماعت مجاہدین ص۱۱۵ و ارواح ثلٰثہ ص۸۱

اسی تشدد و تصلّب کی وجہ سے وہ اپنی تحریروں میں ایک دردمند اور محبّت کیش صوفی کے بجائے ایک تُند خو اور سخت گیر مُلّا نظر آتے ہیں۔ ان کے اندازِ دعوت میں حکمت کا یہ پہلو بھی نمایاں نہیں تھا۔ انہوں نے اصول کے بجائے فروع پر زیادہ زور دیا ہے...... اپنے افکار معتقدات کے اظہار میں نہ موقع و محل کا امتیاز روا رکھا، نہ مخاطبین کی قوتِ ہضم ہی کی کوئی رعایت کی۔ وہ تدریج کے اصول کو بھی فراموش کر بیٹھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ نادانستہ طور پر وہ وصل کے بجائے فصل کا باعث بن گئے۔ انہوں نے اپنے شعلہ فشاں اور آتش بار مواعظ میں تکفیرِ مسلمین کا وہ زور باندھا کہ خود ان کے خاندان کے بہت سے ارادت کیش اور نیاز مند چیخ اٹھے اور خود انہی کے کئی بنی عم ان سے مناظرہ پر مجبور ہو گئے۔ اور اس طرح ایک صاحبِ دل، محبّت شعار اور صحیح الفکر صوفی (سید احمد شہید) کی ابھرتی ہوئی تحریک کو ایک نیک نہاد، پاک جان اور بلند کردار مگر گرم خو، شعلہ مزاج اور عجلت پسند مُلّا نے پورے اخلاصِ نیّت کے ساتھ اپنی بے تدبیری اور غیر حکیمانہ طریقِ دعوت سے ناکام بنا دیا۔

شاہ اسماعیل کو وہ ثبات و استقلال بھی عطا نہیں ہوا تھا جو ایک مدرس کے خصائص میں سے ہے۔ ایک مدرس کو آبشار کی سی تُند روی کی نہیں کوہِ گراں کے وقار کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ برسوں مسندِ درس سے چپکا رہتا ہے جب کہیں جا کر تلامذہ کی ایک جماعت تیار کر سکتا ہے۔ شاہ اسماعیل ۱۷۷۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں ۱۷۹۴ء میں تحصیل تعلیم سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ ۱۸۱۷ء میں چالیس سال کی عمر میں سید صاحب کے ساتھ تحریکِ جہاد میں شریک ہوئے تھے۔ فراغتِ درس اور شرکتِ تحریک کا درمیانی عرصہ ۲۰/۲۲ سال ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے تدریس کی طرف جمعیتِ خاطر کے ساتھ توجہ نہیں کی اور اس لئے ان کے تلامذہ و مستفیدین کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ پھر ایسے عالم سے تو ہم بے خبر ہیں جس نے ان سے سندِ حدیث لی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے کبھی کسی طالب علم کو وقت اور توجہ کے صَرف و عطف سے اس حد تک اپنی طرف راغب نہیں کیا کہ وہ اپنے متعلمانہ سفر کو انہیں کی رہبری میں اختتام کو پہنچاتا۔ اپنے خاندانی فنِ حدیث سے شاہ اسماعیل کی بے اعتنائی اور غفلت کی وجہ سے ہی وہ محدّث نہیں کہلائے۔

شاہ اسماعیل کے انتخاب میں سب سے بڑا مانع، عدم تقلید کی طرف ان کا رجحان تھا۔

اس سلسلہ میں جب ہم اس خاندان کے فکر کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ دلچسپ صورتِ حالات سامنے آتی ہے۔

شاہ اسماعیل کے پردادا اور شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم کا فقہی مسلک جمہور احناف سے کسی حد تک مختلف تھا اور اس میں ایک حد تک توسّع تھا۔ شاہ ولی اللہ کا بیان ہے کہ [1]

حضرت ایشاں در اکثر امور موافق مذہب حنفی عمل می کردند الّا بعض چیزہا کہ بحسبِ حدیث یا وجدان بمذہبِ دیگر ترجیح می یافتند ازآں جملہ آن است کہ در اقتدا سورۂ فاتحہ می خواندند و در جنازہ نیز۔

والد ماجد اکثر امور میں مذہبِ حنفی کے موافق عمل کرتے تھے۔ ہاں بعض مسائل میں حدیث یا وجدان کی رو سے دوسرے مذہبِ فقہی کو قابلِ ترجیح پاتے تھے۔ ان ہی مسائل میں سے ایک یہ ہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے تھے اور نماز جنازہ میں بھی سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے۔

شاہ ولی اللہ نے اپنے والد سے یہ توسّع ورثہ میں پانے کے ساتھ جب تحصیلِ حدیث کے لئے سفر حجاز کیا تو وہاں انہیں ○ جن شیوخ سے استفادے کا موقع ملا وہ شافعی مسلک کے تھے اور ○ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کتابوں کا مطالعہ کیا [2] اور ان سے متاثر ہوئے۔

یہ بھی مستبعد نہیں ہے کہ محمد بن عبدالوہاب سے بھی ان کے روابط رہے ہوں کیوں کہ جس طرح دونوں کا سن ولادت ایک ہے اسی طرح دونوں کی حاضری مدینہ منورہ کا عہد بھی ایک ہی تھا۔ [3]

---

[1] انفاس العارفین۔ [2] بلکہ شاید وہ یہ کتابیں اپنے ساتھ وطن لے بھی آئے تھے اور ان کو مطالعہ میں رکھتے تھے کیونکہ الفوز الکبیر کے باب دوم کی فصل دوم کی ایک عبارت اور حجۃ اللہ البالغہ میں ایک صفحہ سے زیادہ عبارت ابن تیمیہ سے نقل کر گئے ہیں اور حوالہ نہیں دیا۔ مولانا سندھی کا بیان ہے کہ الفوز الکبیر میں متشابہات کی بحث اور ازالۃ الخفا کے بعض سیاسی مسائل ابن تیمیہ سے ماخوذ ہیں "شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ" ص ۲۷ "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" ص ۹۲۔

[3] علامہ سید سلیمان ندوی کا ارشاد ہے کہ دونوں کا منبعِ فیض ایک ہی تھا۔ محمد بن عبدالوہاب۔ از مسعود عالم ندوی ص ۲۸

ان عوامل کے بنا پر اُن کے نقطۂ نظر میں جو انقلاب آیا تھا اس کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ خالص "حنفی" نہیں رہے تھے۔ حجاز سے مراجعت کے بعد ان کی زیادہ توجہ فقہِ حنفی اور فقہِ شافعی میں تطبیق و توافق پر صرف ہوتی رہی اور نتیجۃً ان کا رُجحان فقہِ شافعی کی طرف زیادہ[1] ہو گیا تھا۔ اور ان کی علمی اور قلمی کاوشوں کے نتیجہ میں برِ عظیم میں عدمِ تقلید کے رجحان کو فروغ ہوا اور اس علاقہ میں عدمِ تقلید کی جو تحریک برپا ہوئی وہ اُن کی فکر کا تقاضا تھی اور یہاں کے اہلِ حدیث کی اکثریت ان ہی کے بالواسطہ یا بلاواسطہ تلامذہ پر مشتمل تھی اور اہلِ حدیث حضرات شاہ صاحب کو بھی اہلِ حدیث ہی شمار کرتے ہیں۔ صاحبِ حیات ولی کا بیان ہے کہ

"نہ وہ مذاہبِ اربعہ مشہورہ میں سے کسی خاص مذہب کے پابند تھے"

مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں کہ[2]

"شاہ صاحب تقلید کے دائرہ سے نکل کر عمل بالحدیث کو اپنا شعار بنا چکے تھے ... اور ان کا مسلک بھی (رفع الیدین) تھا"

یہی رویہ مولوی عبدالحی حسنی[3] اور یحییٰ خاں نوشہروی کا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے شاہ صاحب کے اس نقطۂ نظر کو مجتہدانہ مسلک، ترکِ تقلیدِ مذاہب اور عمل بالحدیث سے تعبیر کیا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ اُس دَور میں شاہ صاحب کے ہم مشرب دو اور بھی حضرات تھے۔ ایک شاہ محمد فاخر الہ آبادی اور دوسرے مرزا مظہر جانِ جاناں۔ مولانا کا ارشاد ہے کہ شاہ ولی اللہ کا مسلک وہی تھا جسے آجکل وہابیت کہا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:[4]

---

[1] ڈاکٹر محمد مظہر نے اپنے ایک تحقیقی مقالہ میں المسوّیٰ اور المصفّیٰ کا جائزہ لے کر بتایا ہے کہ ان کتابوں میں کل ۱۱۶۰ ابواب ہیں۔ لیکن ایسے ابواب و مسائل جو مختلف فیہ بھی ہیں اور ان میں شاہ صاحب نے اپنا رجحان بھی ظاہر کیا ہے اور تطبیق بھی نہیں دی ۱۶۹ ہیں۔ اور ان میں شاہ صاحب کے مذاہبِ اربعہ کی جانب رجحان کا تناسب یہ ہے امام احمد کی جانب ۵ مسائل و ابواب میں۔ امام مالک کی جانب ۹ میں۔ امام اعظم کی جانب ۲۱ میں اور امام شافعی کی جانب ۱۳۴ میں۔ [2] معارف اعظم گڑھ شمارہ ۳ جلد ۵۱۔

[3] الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند طبع دمشق ص ۱۰۳ [4] نقشِ آزاد مرتبہ غلام رسول مہر ص ۲۲

وہابیت وغیرہ کے تلقب تو اس وقت تک پیدا نہیں ہوئے تھے۔ نہ کوئی خاص جماعت اس مسلک کی ملک میں موجود تھی اس لئے عامۂ علمار مختلف طریقوں سے اسے تعبیر کرتے تھے۔ عام طور پر اعتزال کا تلقب اختیار کر لیا گیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ شاہ ولی اللہؒ اعتزال کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ کجا معتزلہ و اعتزال اور کجا مشربِ اصحابِ سلف و حدیث؟

شاہ ولی اللہ کی خلافت و ولایت کا بار شاہ عبدالعزیزؒ نے اُٹھایا۔ وہ ہر پہلو سے اس خلافت کے اہل نکلے اور باپ کے علوم کے وارث ہوئے مگر ساتھ ہی فکرِ مستقیم سے موفق ہونے کی بنا پر اپنے والد ماجد کی طرح تطبیق و توافق کی سعی انہوں نے کسی فن میں بھی نہیں کی فلسفہ، کلام، تصوف، فقہ، حدیث، تفسیر کسی فن میں بھی ان کی تحریر کا مطالعہ کیجئے یہ آپ کو متضاد و متخالف بیانات اور نظریات مبتلائے تشویش کر دیں گے۔ نہ عبارت میں ابہام ہوگا نہ افکار میں خنذوذ ہوگا نہ آرار میں تفرد۔ فقہ میں تو وہ یک سُو اور اول و آخر حنفی تھے۔ اور مولانا مسعود عالم ندوی کو بھی وہ "فقہ حنفی سے مقید نظر آتے ہیں" [۱]

مولانا ابوالکلام نے تفصیل سے کام لیا ہے اور دعویٰ کیا ہے [۲] کہ "اوائل میں اُن کا قلم بے اختیار اپنے والد کے مسلک پر چلنے لگا تھا پھر رُک گئے اور احتیاط کے ساتھ قدم اُٹھانے لگے۔"

اور اپنے والد کے مسلک سے انحراف کا سبب یہ بتایا ہے کہ [۳]

"مقبولیت کی عام راہوں سے بے پروا ہو کر کام نہ کر سکے اور شاہِ راہ عام پر چلنے کے سوا چارہ کار نہ دیکھا.... اگر اپنے والد کے مسلک پر رہتے تو مقبولیتِ عام سے دست بردار ہونا پڑتا۔ افسوس یہی مقبولیت عوام ہمیشہ علمار کے لئے سب سے بڑا فتنہ رہی۔"

ہمیں نہ مولانا کے اِس تجزیہ سے اتفاق ہے نہ اس توجیہ سے۔ مولانا کی صرف اس بات سے ہمیں اتفاق ہے کہ شاہ عبدالعزیزؒ شاہ ولی اللہ کے مسلک پر نہیں تھے۔ اور "اصحاب سلف و حدیث" کی شاہ عبدالعزیزؒ سے برہمی ہی ہماری نظر میں ان کی حنفیت کی سند ہے۔

---

[۱] معارف اعظم گڑھ شمارہ ۳ جلد ۵۱۔
[۲] نقش آزاد۔ [۳] ایضاً۔

شاہ عبدالعزیزؒ نہ صرف اپنے والد کے مسلک پر نہیں تھے بلکہ وہ کئی جگہ بڑے سلیقہ اور شائستگی کے ساتھ اپنے والد کے نظریات کا رد کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً "رسالہ اصول مذہبِ حنفی" اور رسالۂ کیفیت اختلاف مذاہبِ اربعہ (شمولۂ فتاویٰ عزیزی) میں اسی طرح "ما یجب حفظہ الناظر" میں بھی طبقات کتبِ حدیث کی بحث میں اپنے والد کے بیان پر انہوں نے اضافہ کیا ہے۔

مختصر یہ کہ شاہ عبدالعزیزؒ حنفیت میں راسخ تھے اور وہ اپنی مسند کے لئے کسی ایسے فرد کا انتخاب گوارا نہیں کر سکتے تھے جو وادیٔ تطبیق و توافق میں سرگرم ہو، چہ جائے کہ عمل بالحدیث کا داعی۔

شاہ اسماعیل نے اپنے عمّ بزرگوار کے مسلک کے بجائے اپنے جدّ بزرگوار کا مسلک اختیار کیا بلکہ اس میں ایک قدم آگے بڑھایا۔ شاہ ولی اللہ عملاً حنفی تھے۔ رفع یدین کے قائل ہونے کے باوجود "مخالفتِ قوم"[1] اور "فتنہ عوام شہر"[2] کے پیشِ نظر رفع یدین نہیں کرتے تھے مگر شاہ اسماعیل نے علی الاعلان مخالفتِ احناف ترکِ تقلید اور عمل بالحدیث نہ صرف خود شروع کیا بلکہ اس کی مہم چلائی۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں۔[3]

"(شاہ اسماعیل نے) اپنے جد امجد کے طریقہ پر عمل بالحدیث شروع کیا۔ انہوں نے ایک خاص جماعت بھی تیار کی جو حجۃ اللہ البالغہ پر عمل کرتی تھی۔ یہ لوگ شافعیہ کی طرح رفع یدین اور آمین بالجہر پر عمل کرتے تھے۔"

مولانا مسعود عالم ندوی شاہ اسماعیل کی تحریکِ ترکِ تقلید کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:[4]

"مولانا شاہ اسماعیل شہید ف ۱۲۴۶ھ نے عمل بالحدیث کی طرح ڈال دی تھی اور دادا

---

[1] وایاک ان تخالف القوم فی الفروع فانہ مناقضۃ لمراد الحق (مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ فروع (فقہ) میں اپنی قوم کے خلاف عمل کرنے سے گریز کرو کیونکہ یہ خدا کی مرضی کے خلاف ہے) فیوض الحرمین ص۶۲

[2] لا ینبغی للانسان فی مثل ہٰذہ الصور ان یثیر علی نفسہ فتنۃ عوام بلدہ۔ (انسان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ اس قسم کی صورتوں میں اپنے شہر کے عوام کے فتنہ میں وہ خود کو ڈالے) حجۃ اللہ البالغہ جلد۲ ص۱۰

[3] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص۱۱۱۔ [4] معارف شمارہ ۳ جلد ۱۵۔

کے بنائے ہوئے خاکے میں ہونہار پوتے نے رنگ بھرنا شروع کردیا تھا۔"

مولانا عبدالحی حسنی جماعت اہلِ حدیث کا تعارف کرانے کے بعد کہتے ہیں کہ وھذا مذھب الشیخ ولی اللہ بن عبد الرحیم الدھلوی وحفیدہٗ اسماعیل بن عبد الغنی بن ولی اللہ۔ (اور یہ (ترکِ تقلید) مسلک شاہ ولی اللہ اور ان کے پوتے شاہ اسماعیل کا ہے)

۱۸۱۷ء میں انہوں نے سید احمد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی تحریکِ جہاد میں شامل ہو گئے اور سید صاحب نے جب ترغیبِ جہاد کے لئے اقطاعِ ہند کے دَورے شروع کئے تو وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ رہتے اور وعظ کہتے تھے۔ اِن مواعظ میں وہ ترغیبِ جہاد پر کم اور تقلیدِ شخصی معیّن کے خلاف زیادہ زور دیتے تھے۔ ان کی تقریروں کا زیادہ وقت ردِّ بدعات و محدثات اور مختلف فیہ مسائل و جزئیات میں صرف ہوتا تھا جس کے نتیجہ میں اس تحریک کو دہلی میں ناسازگار حالات کا سامنا کرنا پڑا اور مسلمان دعوتِ جہاد کو "دعوتِ عدمِ تقلید" سمجھنے لگے اور اس اضطراب نے جامع دہلی کی اس مجلسِ مناظرہ کی شکل اختیار کرلی جس میں پہلی بار ولی اللّٰہی خاندان کے باہم اختلافات منظرِ عام پر آئے۔ یہی نہیں بلکہ رسائل و فتاویٰ کا بھی تبادلہ ہونے لگا اور تلخی بڑھنے لگی۔ مگر شاہ اسماعیل کے سفرِ حج پر روانہ ہوجانے کی وجہ سے یہ ہنگامہ فرو ہوگیا۔

سفرِ حج سے واپسی کے فوراً بعد شاہ اسماعیل کاروانِ جہاد کے ساتھ سرحد کی طرف رواں ہوگئے اور اب اُن کی شعلہ نوائیوں کا ہدف مسلمانانِ سرحد تھے اور شاہ اسماعیل نے خوانینِ سرحد کو بھی آزمائش میں مبتلا کردیا۔ ایک طرف جہاد جیسے رکنِ اسلام کی دعوت تھی جس سے انکار کی تاب نہیں تھی لیکن ساتھ ہی ترکِ تقلید کا نعرہ بھی تھا جس سے اتفاق دشوار تھا۔ بالآخر خوانین نے خود سیّد صاحب کو خط لکھ کر رفعِ شکوک کرنا چاہا اور اس خط میں سیّد صاحب سے خود اُن کے اور شاہ صاحب کے مسلکِ فقہی کے متعلق سوال کیا۔ سید صاحب نے اس خط کے جواب میں پہلے اپنے اور اپنے بزرگوں کے متعلق لکھا:[۵۲]

مذہب ایں فقیر اباً عن جدٍ مذہبِ حنفی است ۔ میرے اور میرے باپ دادا کا مذہب حنفی

---

[۵۱] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند طبع دمشق ص۱۰۱ - [۵۲] مکتوبات شاہ اسماعیل شہید طبع کراچی ص۲۲۰

است و بالفعل ہم جمیع اقوال و افعال این فقیر بر قوانین و اصول حنفیہ و آئین و قواعد ایشاں منطبق ست یکے ازاں خارج از اصول مذکورہ نیست۔

ہے اور آج کل بھی میرے تمام اقوال و افعال احناف کے قوانین و اصول اور آئین و قواعد کے مطابق ہیں اور میرا کوئی ایک قول و فعل بھی احناف کے اصول سے خارج نہیں ہے۔

پھر نام لئے بغیر شاہ اسماعیل اور ان کے رفقاء و متبعین کے مسلک کی وضاحت اِس طرح کی ہے۔ (کیونکہ دراصل علماءِ پٹنا ور نے خط شاہ صاحب کے طرزِ عمل کے پیشِ نظر ہی لکھا تھا)

آرے در ہر مذہب طریقۂ محققین دیگر می باشد و طریق غیر ایشاں دیگر، ترجیح بعض روایات بر بعض دیگر نظر بہ قوت دلیل و توجیہ بعض عبارات منقول از سلف و تطبیقِ مسائل مختلفہ در کتب و امثال ذلک و انما از کار ہائے اہلِ تدقیق و تحقیق ست باین سبب ایشاں خارج از مذہب نمی توانند شد بلکہ ایشاں را لب لباب آں اہلِ مذہب باید شمرد۔

لیکن ہر مذہب (فقہی) میں محققین کا طریقہ الگ ہوتا ہے اور غیر محققین (عامہ علماء) کا الگ، کسی روایت کو کسی پر ترجیح دینا، قوتِ دلیل کا لحاظ کرنا علماء و سلف کی بعض عبارتوں کی توجیہ ان کی کتابوں کے مختلف فیہ مسائل میں تطبیق اور اس جیسی بہت سی باتیں ہمیشہ سے محققین و مدققین کا معمول رہا ہے مگر اس معمول کی وجہ سے ان کو اس مذہب سے خارج شمار نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس قسم کے علماء (محققین و مدققین) کو اس مذہب کی جان سمجھنا چاہیئے۔

اِس مکتوب میں جہاں تک سید صاحب نے اپنے متعلق لکھا ہے ہمیں اس سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ وہ ہماری معلومات کے مطابق بھی حنفی اور ایسے ہی "درجے" کے حنفی تھے کہ جمیع اقوال و افعال میں سے ایک بھی حنفیت سے خارج نہیں تھا مگر شاہ اسماعیل کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی صحت میں ہمیں تامل ہے۔ ہم مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبدالحئی حسنی کے الفاظ نقل کر چکے ہیں کہ شاہ صاحب نے عمل بالحدیث شروع کر دیا تھا اور آمین بالجہر اور رفع یدین کرنے لگے تھے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ کیا آمین بالجہر اور رفع یدین کے بعد اور تقلیدِ شخص معین کے خلاف زورِ تحریر و تقریر صرف کر دینے کے باوجود بھی کوئی حنفی رہ سکتا ہے؟ ہمارے خیال میں یہ صرف اسی وقت ممکن ہے کہ حنفیت کی کوئی ایسی عمومی تعریف

کی جائے جو شافعیہ اور غیر مقلدین کو بھی جامع ہو ورنہ شاہ اسماعیل کو متعارف معنوں میں حنفی کہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ قول و عمل دونوں اعتبار سے اہلِ حدیث تھے اور شاہ عبدالعزیز کی نظر میں مسند عزیزی پر تمکن کے لئے قطعاً موزوں نہیں ہو سکتے تھے۔

لامحالہ متذکرہ بالا ارکانِ بزمِ رحیمی میں سے صرف شاہ محمد اسحاق کی ذاتِ گرامی ہی ایسی رہ گئی تھی جس پر شاہ عبدالعزیز کی نگاہِ انتخاب پڑتی۔ چنانچہ وہی منتخب کر لئے گئے۔

ممکن ہے یہ انتخاب کرتے وقت شاہ عبدالعزیز اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ کی اس پیشین گوئی سے بھی متاثر ہوں۔ [1]

"آگاہی آمد ایں فرزنداں کہ لطف الٰہی اندریا عطا کردہ است و ہمہ سعداً اندو نوعے از ملکیت در ایشاں ظہور خواہد کرد لیکن تدبیر غیب چنیں تقاضا می کند کہ دو شخص دیگر پیدا شوند کہ در مکہ و مدینہ سالہا احیاء علوم دین نمایند و ہماں جا وطن اختیار کنند از طرف ما در نسب ایشاں بما متمکن باشد۔"

مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں: [2]

"انہوں نے (شاہ عبدالعزیز) اپنے آخری وقت میں مولانا محمد اسحاق کو مدرسہ سپرد کر کے اپنا قائم مقام بنا دیا تھا۔"

مولوی عبدالحی الحسنی لکھتے ہیں۔ [3]

وکان بمنزلة ولده واستخلفه الشیخ المذکور ووهب له جمیع ماله من الکتب والدور وجلس بعده مجلسه وافاد الناس احسن الافادة۔	شاہ عبدالعزیز نے اپنے اس نواسہ کو بیٹے کی طرح چاہا اور انہوں نے ان کو اپنا خلیفہ بھی بنا دیا تھا اور مکانات و کتابیں بھی ان کو ہی ہبہ کر دی تھیں اور یہی شاہ صاحب کے بعد ان کی مسند پر بیٹھے اور لوگوں کو خوب فائدہ پہنچایا۔

مولوی ذوالفقار احمد بھوپالی الروض المسطور میں لکھتے ہیں۔ [4]

---

[1] الرسالة الوصیة فی النصیحة والوصیة، مطبع احمدی ہوگلی بنگال سن ندارد۔ [2] سیاسی تحریک ص۱۱۔
[3] نزہۃ الخواطر الجزالسابع ص۱۸۔ [4] بحوالہ مولانا نسیم احمد فریدی الرحیم حیدرآباد سندھ جون ۱۹۶۶ء۔

شاہ عبدالعزیز نے آخری وقت میں اپنا فرش (؟) اور ذاتی کتب خاص مولانا محمد اسحاق کو ہبہ کردی تھیں۔ مولانا جعفر علی نقوی نے شاہ صابر بخش دہلوی کا قول شاہ اسحاق کے متعلق نقل کیا ہے[1]:

"من شما را قائم مقام حضرت افضل المحدثین می دانم۔"

واضح رہے کہ شاہ صابر بخش کا وصال ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء میں شاہ عبدالعزیز کی وفات (۱۸۲۴ء) سے قبل ہوا تھا۔

مولانا فضل رسول بدایونی نے البوارق المحمدیہ (ص۲۰) میں اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے جانشینی کے عہد کا تعین بھی ہوجاتا ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ جب شاہ عبدالعزیز نے اپنے منقولہ وغیر منقولہ مملوکات کو اپنے نواسوں کو ہبہ کرکے ان کو اس پر قابض اور متصرف کردیا تو شاہ اسماعیل کو یہ بات ناگوار گذری اور اس کے بعد ہی انہوں نے مولوی عبدالحی بڈھانوی کی سعیت میں سید صاحب سے بیعت کی اور تحریکِ جہاد میں شمولیت اختیار کی[2]۔
معلوم ہے کہ شاہ اسماعیل نے سید صاحب سے ۱۸۱۸ء میں بیعت کی تھی لہٰذا شاہ محمد اسحاق کی جانشینی کا واقعہ بھی ۱۸۱۷ء یا اس کے قبل کا ہوا۔

سفرِ حج

۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں شاہ صاحب فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے حجاز تشریف لے گئے اور دو سال بعد واپس تشریف لائے۔ ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء

اس وقت آپ کی عمر ۴۲ سال ہوچکی تھی۔ زیارتِ حرمین کی تڑپ برسوں سے سفرِ حجاز کے لئے اکساتی رہی ہوگی مگر اپنے نانا، مرشد اور اُستاد حضرت شاہ عبدالعزیز کے آخری سنین

---

[1] منظورۃ السعداء ص۱۲۶ مخطوطہ کتب خانہ سعیدیہ ریاست ٹونک۔

[2] مولانا بدایونی نے بصراحت لکھا ہے کہ سید صاحب سے بیعت خاندانی نظریات سے بغاوت اور وہابیت کی طرف میلان یہ سب اسی واقعہ (شاہ اسحاق کی جانشینی) کے نتائج ہیں۔ ورنہ اس سے قبل شاہ اسماعیل اپنے بزرگوں کے مسلک پر تھے اور شاہ عبدالعزیز کے یہاں ہر سال موئے مبارک کی زیارت ہوتی تھی تو موئے مبارک کا صندوقچہ شاہ اسماعیل ہی کے گھر سے باہر اپنے سر پر اٹھا کر لاتے تھے۔ (البوارق ص۱۰۶) موئے مبارک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ عبدالرحیم کو خواب میں عطا فرمائے تھے۔ (انفاس العارفین ص۴۲)

حیات میں ان کی خدمت کے جذبہ نے باز رکھا ہوگا۔ اُن کے وصال کے چند ہی ماہ بعد[1] شاہ صاحب نے اپنی اس آرزو کی تکمیل کا موقع نکالا اور دیارِ حبیب کی زیارت اور حج بیت اللہ کا فرض ادا کرنے کے لئے روانہ ہوگئے۔[2]

اِس سفر کے سلسلہ میں دوسری خاص بات یہ ہے کہ اس سے چند ہی ماہ پہلے (ذی قعدہ ۱۲۳۹ھ میں) انہیں کے گھرانے کا ایک کاروان سفرِ حج سے لوٹا تھا یعنی حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل اور دوسرے اعزہ رو رفقاء۔ شاید یہ مزاج و مسلک کا اختلاف ہو کہ شاہ اسحاق صاحب نے ان کی معیت اختیار نہیں کی اور اس کارواں کی مراجعت کے چار پانچ ماہ کے بعد عازم حج ہوئے۔

اِس سفر میں شاہ صاحب نے ادائے فرض کے علاوہ حدیثِ نبویؐ کی قرأت و سماعت بھی کی اور مکہ معظمہ میں استادِ وقت شیخ عمر بن عبد[3] الکریم بن عبد الرسول سے سندِ حدیث حاصل کی۔[4]

شیخ عمر بن عبد الکریم نے اس ثبت پر جو انہیں ان کے شیخ علامہ محمد طاہر بن محمد سعید بن محمد سنبل نے عطا کیا تھا، شاہ صاحب کو حسب ذیل "اجازہ" لکھ کر دیا تھا۔[5]

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ والہٖ وصحبہٖ وبعد فیقول الفقیر الحقیر عمر بن عبد الکریم بن عبد الرسول عفا اللہ تعالیٰ عنہ انہ قد سمع منی جمیع ھٰذا المولف العلامۃ الفھامۃ التقی الناسك مولانا وسیدنا الشیخ محمد اسحاق بن مولانا محمد افضل الدھلوی سبط مولانا المولوی عبد العزیز العلامۃ الشھیر بقراءۃ غیرہ علیّ وھو یسمع وقد اجزتہ بجمیع

---

[1] شاہ عبد العزیز کا وصال شوال ۱۲۳۹ھ (۱۸۲۴ء) میں ہوا اور شاہ اسحاق صاحب ۱۲۴۰ھ کے کسی مہینہ میں روانہ ہوئے۔ اگر مہینہ جمادی الاولیٰ کا متعین کریں تو وفات کے سات ماہ بعد روانگی ہوئی ہوگی۔

[2] آخری وعظ میں آیت وآتی المال علیٰ حبہٖ ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل کا بیان کیا اور اس کے مطابق نقد اور اسباب سب تقسیم فرمایا۔ من بعد قریب لاکھ روپے کے نقد اور دوسرا اسباب بیش قیمت جو رہا تھا اس میں سے چند ہزار روپے واسطے زادِ راہ سفرِ حجاز اور ادائے مناسکِ حج و عمرہ اپنے نواسے میاں محمد اسحاقؒ اور میاں محمد یعقوب صاحبؒ کو عنایت فرمائے۔ (مقالاتِ طریقت ص۴۰)

[3] شیخ عمر بن عبد الکریم بن عبد الرسول المالکی الحنفی ف ۱۲۴۷ھ۔

[4] نزہۃ الخواطر ج۷ ص۵۲

[5] یہ ثبت "ثبت اوائل" کے نام سے مطبع احمدی دہلی سے ۱۳۰۰ھ میں شائع ہو چکا ہے مگر یہ "اجازہ" ہمارے علم کی حد تک آج تک طبع نہیں ہوا بلکہ اس کے مخطوطات بھی کہیں نظر سے نہیں گزرے اس لئے ہمارے کتب خانہ میں اس کا جو مخطوطہ ہے اس کو محفوظ کر دینے کے خیال سے مکمل نقل کرتے ہیں۔

ما اوما الیہ ھذا التالیف من التصنیف والتالیف

بحق روایتی لہ عن شیخنا العلامہ محمد طاھر بن العلامہ الشیخ محمد سعید سنبل

عن والدہ محمد سنبل المذکور مؤلف ھذا التالیف بسندہ واصلہ بل واجزت المذکور

مولانا محمد اسحاق المذکور بکل ما ثبت عندہ ان لی روایتہ واللہ ینفعہ بہ ویجعل

الجمیع من حزبہ وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد آلہ وصحبہ وسلم۔

مہر (عمر بن عبدالکریم بن عبدالرسول)

یہ اجازہ غیر مؤرخ ہے۔

اس کے بعد ہمارے مخطوطہ میں ایک اور اجازہ ہے جو شیخ محمد عمر بن عبدالکریم بن عبدالرسول نے شاہ صاحب کو دیا تھا۔ پہلا اجازہ صرف شیخ محمد طاہر بن شیخ محمد سعید بن محمد سنبل سے روایتِ حدیث کا تھا۔ یہ اجازہ عام ہے۔ دوسرے طرق واسانید کا بھی اس میں بیان ہے اور اپنے دوسرے شیوخ و اساتذۂ حدیث کا بھی ذکر ہے۔ اس کے علاوہ حدیث و اصول حدیث ہی نہیں تفسیر اور دوسرے علومِ دینیہ بلکہ معقول و منقول کی تمام مولفات کا اجازہ عام ہے۔ ذیل میں یہ اجازہ مکمل نقل کیا جاتا ہے۔

الحمد للہ الذی انزل السنتہ الغراء اضوء من الصبح الابلج۔

اِس تحریر پر تاریخ "سلخ[1] ذی القعدۃ الحرام سنہ ۱۲۴۱ھ" درج ہے۔ مہر بھی ہے۔

اس کے بعد قرأت قرآن مجید کا اجازہ ہے۔ اس پر ۲۶ ذی الحجہ سنہ ۱۲۴۱ھ کی تاریخ ثبت ہے۔ صفحات آئندہ میں یہ اجازہ بھی مکمل نقل کیا جائے گا۔

اِس سلسلہ میں یہ بات بطور خاص قابلِ توجہ ہے کہ اِس خانوادے کے دو افراد شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحئی بڑھانوی جن سے شاہ صاحب کی کئی کئی قرابتیں تھیں، پانچ چھ ماہ پہلے ہی حج کر کے آئے تھے وہاں قاضی محمد بن علی الشوکانی سے سندِ حدیث حاصل کی تھی مگر اس قرابت کے باوصف اِس گروہِ خاندان اور شاہ صاحب میں ذہنی قربت نہیں تھی بلکہ بعد و اختلاف تھا۔ دونوں کے راستے مختلف تھے۔ رجحانات و میلانات مختلف تھے۔ چنانچہ اُن

---

[1] آخری ایام ماہ۔

کے شیوخِ حدیث بھی مختلف تھے۔ اِن شیوخ کا اختلاف صرف اشخاص کا اختلاف نہیں تھا اُن کے مکاتیبِ فکر کا اختلاف تھا۔ شیخ عمر بن عبد الکریم نے خود کو حنفی لکھا ہے۔ وہ وطناً بھی حجازی مکی ہیں نجدی نہیں۔ ادھر قاضی شوکانی، حجازی نہیں یمنی ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے عقیدے کے لحاظ سے انہیں زیدی لکھا ہے۔ وہ مسلکاً حنفی بھی نہیں تھے۔ برعظیم کے.... ان دونوں حضرات کے علاوہ، ایک اور شاگرد مولوی عبد الحق بنارسی تھے جو اہلِ حدیث گروہ کے ایک پُر جوش اور سرگرم مبلّغ اور رہنما اور نواب صدیق حسن خاں کے استادِ حدیث تھے۔ اجازہ قراءت کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب ذوالحجہ ۱۲۴۱ھ کے آخر تک حجاز ہی میں تھے اور دہلی سے مجاہدین نے جہادِ سرحد کے لئے جمادی الثانی ۱۲۴۱ھ[3] میں آغازِ سفر کیا تھا۔ شاہ صاحب، مجاہدین کی روانگی کے وقت دہلی میں نہیں تھے۔ اس میں مجبوریوں کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ مگر اس گروہ سے ہر ہر بات میں شاہ صاحب کے اختلافات اور بے تعلقی کے پیشِ نظر یہ بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ شاہ عبد العزیز کے جانشین کی عدم موجودگی میں ان کے مستفیدین و مسترشدین کے قافلہ کی انہیں کے گھر سے ایسے اہم سفر پر روانگی بے وجہ اور بے سبب نہیں ہو سکتی۔ مجاہدین کو ان کا انتظار نہ کرنے میں کوئی مجبوری تھی[4] یا اس میں اس ذہنی بُعد اور اختلافِ مسلک کو دخل تھا، جو ان دونوں گروہوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

---

[1] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ [2] شاہ اسحاق صاحب کے دو تلامذہ قاری عبد الرحمٰن پانی پتی اور نواب قطب الدین خاں بھی یہاں کے اہلِ حدیث کا رشتہ شیعیت سے ثابت کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو کشف الحجاب قاضی عبد الرحمٰن پانی پتی و تنویر الحق، مولوی نواب قطب الدین خاں، مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی نظامِ تعلیم و تربیت حصّہ دوم میں شیعوں کے اخباری فرقہ کو (وہابی شیعہ) ثابت کرتے ہوئے شیعوں اور وہابیوں میں کئی باتوں میں توافق بتایا ہے۔ کچھ تاریخی اتفاقات کی طرف بھی انہوں نے اشارہ کیا ہے۔

[3] وفات شاہ عبد العزیز (شوال ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) کے صرف ایک سال ۹ ماہ بعد۔ [4] مولوی سید عبد الحی سے میاں نذیر حسین نے فرمایا کہ مولانا محمد اسماعیل صاحب (حج سے واپسی کے بعد) قریب پانچ چھ مہینے کے یہاں رہے۔ جب شاہ کاف صاحب کلکتہ سے دہلی آئے تو استعجالاً دہلی سے چلے گئے کیونکہ کلکتہ میں اس سے مولانا کی بحث ہو گئی تھی۔ "دہلی اور اس کے اطراف" ص۵۵ مگر ہمارے خیال میں عجلت کا یہ سبب معقول نہیں۔ مہر صاحب نے بھی اس کو تسلیم نہیں کیا (جماعتِ مجاہدین ص۱۲۲) اصل سبب یہی ذہنی بُعد اختلاف ہے

اجازت نامہ بنام مولانا اسحاق صاحب مرحوم ومغفور۔ الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ وآلہ وصحبہ وبعد فیقول الفقیر الحقیر عمر بن عبد الکریم بن عبد الرسول عفا اللہ تعالیٰ عنہ انہ قد سمع علیّ جمیع ھذا المولف العلامہ الفہامہ التقی الناسک مولانا وسیدنا الشیخ محمد اسحاق بن مولانا محمد افضل الدھلوی سبط مولانا المولوی عبد العزیز العلامۃ الشھیر بقراءۃ غیرہ علیّ وھو یسمع وقد اجزتہ بجمیع ما اومأ الیہ ھذا التالیف من التصنیف والتالیف بحق روایتی لہ عن شیخنا العلامہ محمد طاھر بن العلامہ الشیخ محمد سعید عن والدہ محمد سنبل المذکور مؤلف ھذا التالیف بسندہ۔ واصلہ بل واجزت المذکور مولانا محمد اسحاق المذکور بکل ما ثبت عندہ ان لی روایتہ واللہ ینفعہ و ینفع بہ و یجعل الجمیع من حزبہ وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔

عمر بن
عبد الکریم بن
عبد الرسول

این صورت مہر اوست

ولنختم سند حدیث المصافحۃ لعل اللہ تعالیٰ لختیم لنا بالصلح والمسامحۃ فاقول وانا الفقیر الی اللہ الغنی عبد الحفیظ بن المرحوم الشیخ درویش العجمی قال قد صافحنی شیخی واستاذی العلامۃ الشہیر سیدی الشیخ احمد الدردیر قال قد صافحنی العارف باللہ تعالیٰ سیدی محمد بن سالم الحنفی قال قد صافحنی العارف باللہ تعالیٰ سیدی محمد البدیری الدمیاطی قال قد صافحنی العارف باللہ تعالیٰ النقشبندی شہاب الدین احمد بن محمد الدمیاطی الشہیر بابن عبد الغنی انہ قال وقد رحل الی الیمن قال قد صافحنی الشیخ الکبیر الفاضل الفقیہ احمد بن عجیب الیمنی فی منزلہ کما صافحہ الکامل المکمل الشیخ تاج الدین النقشبندی الہندی کما صافحہ الامام العارف باللہ الشیخ عبد الرحمن الشہیر بحاجی رمزی کما صافحہ مولانا الفاضل الحافظ علی الاوبہی کما صافحہ مولانا الاستاذی محمد استقرازی کما صافحہ ابو سعید الحبشی الصحابی رض کما صافحہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ومن فوائد المصافحۃ حصول البرکۃ والخیر وروی ان النبی صلی اللہ

علیہ وسلم قال من صافحنی او صافح من صافحنی الی یوم القیامۃ دخل الجنۃ۔

ھٰذا وقد تلقیتاہ المصافحۃ بما صورتہ ھٰکذا :-

والحمد للہ رب العالمین وقد رقمہا الفقیر الحقیر المعترف بالذنب والتقصیر الراجی شفاعۃ النبی العربی عبد الحفیظ بن المرحوم درویش العجمی غفر اللہ لہ ولوالدیہ وجمیع المسلمین بجاہ محمد وآلہ وصحبہ الاکرمین وکان الفراغ من کتابتہا یوم الربوع شہر ذی القعدۃ فی بلد الحرام ۱۲۳۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وبہ نقتی الحمد للہ الذی انزل السنۃ الغراء اضوء من الصبح الابلج کما انزل احسن الحدیث کتابا متشابہا غیر ذی عوج والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد المرسل وافضل من الی السماء عرج واعظم من اوتی الحکمۃ وجاء بالمعجزات والحجج وعلی آلہ طیبی الأرج وعوالی الرتب والدرج واصحابہ الذین بذلوا فی احیاء سنتہ المنہج ومن فی نظام سلکہم اندرج اما بعد فقد التمس الشیخ الفاضل السابق فی حلیۃ الفضائل الباذل فی تحصیل العلوم الشرعیۃ الجہد المثمر فی اقتناصہا عن ساعد الجد مولائی علامہ الفہامہ المولوی محمد اسحاق بن محمد افضل الدھلوی جعلہ اللہ من ائمۃ المتقین ونفعہ ونفع بہ المسلمین الاجازۃ فیما یجوز لی روایتہ وتصح لی درایتہ بعد ان سمع منی الحدیث المسلسل بالاولیۃ وسمع علی جملۃ وافرۃ من الجامع الصحیح لذی القدر الرجیح محمد بن اسماعیل البخاری وشیئا من صحیح الامام مسلم بن الحجاج القشیری واوائل جملۃ من الکتب الحدیث فاجبتہ لذلک واسعفتہ الی ما ھنالک عملا بحسن ظنہ واعانۃ لہ علی مطلوبہ من تعدد الطرق والاسانید الی نحو متون الحدیث وفنہ حیث کان الاسناد من الدین ولولاہ لکان مالا یدفع من الملحدین علی ان روض ھذا العلم قد ذوی ربعہ الماھول قد روی وناد یہ قد خلا واعرض عنہ وجوہ الملاء وولت دولتہ وذھبت صولتہ وذھبت شارتہ وخمدت شرارتہ وانی احقر من ان اکون من فرسان ھذا المیدان واقل من ان اذکر بلسان اویشار الی ببنان ومکن البلاد اذا اقشعرت وصیتوح بنتہا روی المہتیم فاقول قد اجزت

الہمام المذکور بجمیع ما یجوز لی روایته من کتب الحدیث کالکتب الستة والجوامع والسنن والمسانید والاجزاء المشیخات والمستخرجات والمستدرکات والمسلسلات وغیر ذلک و من کتب التفسیر وعلومہ کعلوم الحدیث واصولیہما وسائر المولفات فی المنقول والمعقول وتعداد ذلک ورفع الاسناد فی جمیع ما ھنالک یودی الی طول وعلی الجملة فقد اجزته اجازة عامة فلیروہ عنی النشاء بشرطہ المضبوط وضبطہ المشروط بروایتی لذلک عن عدة من المشائخ الاجلاء الاعلام النبلاء الکرام منہم وھو اولہم حامل الواء الروایة والاسناد من اللہ علی العباد ملحق الاحفاد بالاجداد ولی اللہ الکامل جامع فنون العلوم وشتات الفضائل ابو الحسن علی بن عبد اللہ بن عبد البر بن عبد الفتاح الشریف الحسینی الوتائی الازہری الشافعی حملت عنہ الکثیر وروایت عنہ من المولفات ما یُعْسَرُ عَدُّہ من صغیر وکبیر وتحملت عنہ بانواع التحمل وتخرجت بہ وتشرقت بسببہ عن مشائخ کثیرین کلفلت باسمائہم مولفاتہ منہم حافظ عصرہ ومحدث وقتہ ودھرہ ابو الفیض محمد مرتضیٰ بن محمد الحسینی الواسطی الزبیدی عن السید عمر بن احمد بن عقیل والشہابین الملوی والجوھری والعفیف الشہراوی وعبد الحیّ البہنسیّ وعبد الرحمٰن بن اسلم و ابراہیم بن جعفر وعبد اللہ بن خلیل کلہم عن عبد اللہ بن سالم البصری واحمد النخلی زاد السید عمر بن عقیل والملوی فقالا وعن الشیخ حسن بن علی العجمی وثلاثہم عن الباھلی وزاد البصری والنخلی و فقالا وعن ابی الضیاء الشہیر الاملسی قال ھو والباھلی اخبرنا الشہاب احمد السبکی والبرھان اللقانی زاد الباھلی وقال وسالم السمہودی وعبد الرؤف المناوی وحجازی الواعظ ومحمد المناوی وابن الشعبی سبعتہم عن النجم الغیطی زاد اللقانی فقال والشمس محمد البوتیمی قالا اخبرنا شیخ الاسلام زکریا الانصاری من شیخ الحفاظ والاسلام ابی الفضل احمد بن علی حجر العسقلانی واسانیدہ فی جمیع القوم اظہر من الشمس فی الظہر فلیرجع الیہا ومن مشائخی ابو الفیض محمد مرتضیٰ الحسینی المذکور استجازہ لی شیخنا العلامہ الوتائی المذکور فکتب لی اجازة بخطہ الشریف من مصر فاروی عنہ عالیا وعن مشائخی المسند الکبیر الشہیر الشیخ مصطفیٰ بن محمد بن رحمة اللہ

انصاری والایوبی الدمشقی ثم المدنی وشقیقاہ فی الاخذ والفضائل علامۃ الشام الشیخ محمد بن عبد الرحمٰن الکزبری والشیخ احمد بن عبید العطار یروی الاول من ذی الفیض الوھبی سیدی عبد الغنی بن اسماعیل النابلسی العارف الکبیر المذکور والاخیران عن الشھاب احمد الشھیر بالنبین عن سیدی الشیخ عبد الغنی بن اسماعیل النابلسی المذکور وھو عن جمع منھم الحافظ النجم محمد الغزی عن والدہ البدر محمد الغزی عن الحافظ جلال الدین عبد الرحمٰن السیوطی والقاضی زکریا کلاھما عن شیخ الحافظ بن حجر العسقلانی ومن اعظم مشائخی شیخ الاسلام الشیخ عبد الملک بن عبد المنعم بن محمد تاج الدین القلعی مفتی مکۃ المشرفۃ اکثر من اربعین سنۃ عن والدہ عن جدہ عن البصری والعجمی واسانید الاول مولفۃ بالامداد بمعرفۃ علو الاسناد جمع ابنہ سالم بن عبد اللہ البصری واسانید الآخر توخذ من مولفاتہ التی منھا اتحاف النفوس الزکیہ فی سادۃ القادریہ ونشر الروائح الندیۃ سلاسل السادۃ الاحمدیہ واسعاف المریدین باسانید الصحیحہ والمشابکۃ والتلقین واتحاف الفرقۃ الفقیریہ الوفیہ باسانید الخرقۃ الصوفیہ واتصال رحمات الالٰھیۃ فی المسلسلات النبویۃ والنشر العطار فی اسانید جملۃ من الاحزاب والاذکار ومن کفایۃ المتطلع تخریج تلمیذہ الفاضل تاج الدین بن احمد بن ابراھیم الدھان ومن اشیاخی خاتمۃ المحدثین ببلد سید المرسلین الامام الرحلۃ صالح بن محمد العمری الفلانی مولف قطف الثمر فی رفع اسانید المصنفات والاثر روی عنہ جمیع ما حواہ وکل مالہ مالم یحولنزھۃ سنین وانتفعت بہ مالا احصی وقد سمعت منہ جمیع صحیح البخاری وجمیع صحیح مسلم وغیرھما فاما صحیح البخاری فیرویہ المذکور عن الشیخ محمد بن سنہ وھو عن جماعۃ اعلاھم سندا الشیخ احمد بن العجل عن مفتی بلد اللہ الحرام قطب الدین محمد بن احمد النھروانی عن الحافظ نور الدین ابی الفتوح احمد بن عبد اللہ بن ابی الفتوح الطاؤسی عن المعمر بابا یوسف الھروی عن محمد بن شاد بخت الفارسی الفرغانی بسماعہ بجمیعہ عن احد الابدال بسمرقند ابی لقمان یحیی عمار بن مقبل بن شاھان الختلانی وقد سمعہ جمیعہ عن محمد بن یوسف الفربری سماعہ عن مولفہ الحافظ ابی عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ واما صحیح مسلم فیرویہ عن شیخہ الشریف

مولوی سلمان الداعی عن بشیخہ حسن العجمی عن الشیخ احمد بن العجل التیمی عن الامام یحییٰ بن مکرم الطبری عن جدہ مجد الدین محمد الطبری عن زین الدین ابی بکر عن الحسین المراغی عن ابی العباس احمد بن ابی طالب الحجار عن الانجب بن ابی السعادات الحانی عن ابی الفرج مسعود بن الحسن الثقفی عن الحافظ ابی القاسم عبد الرحمٰن بن مندہ عن الحافظ ابی بکر محمد ابن عبد اللہ الجوزی عن ابی الحسن مکی بن عبدان عن مولفہ الحافظ الحجۃ ابی الحسین مسلم بن الحجاج القشیری النیشاپوری رحمۃ اللہ تعالیٰ ولی مشائخ آخرون کثیرون مکیّون ومدنیون ومصریون وشامیون ویمنیون ومغربیون لکل منہم عظیم المنۃ علی جمعنی اللہ وایاہم فی دار کرامۃ وفیما ذکرتہ کفایتہ ومقنع وبہ تحصیل المقصود واذا الرجوع الٰے فہارسہم شرع معدود: سلکک اللہ بالجمیع احسن المسالک انہ القدیر المالک آمین!

ہٰذا واوصی المجاز المذکور بتقوی اللہ تعالیٰ ولزوم طاعتہ وملازمۃ العلم والزکر لاسیماء لا الہ الا اللہ واوصیہ بالشفقتہ والرافۃ بالمومنین خصوصا المقبلین علی العلم والمتوجہین الیہ واسالہ ان لاینسانی من صالح دعواتہ فی خلوتہ وجلواتہ ووالدی واولادی و مشائخی والمسلمین لاسیما ببلوغ المرام حسن الختام والفوز برضاء الملک العلام ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم وحسبنا اللہ نعم الوکیل وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد وآلہ وصحبہم وسلم قالہ مجلاً الفقیر الی اللہ تعالیٰ عمر بن عبد الکریم بن عبد الرسول المکی الحنفی غفر اللہ لہم آمین فی سلخ ذی القعدۃ الحرام سنہ ۱۲۳۶ھ

عمر بن
عبد الکریم ابن
عبد الرسول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اما بعد فیقول الفقیر عمر بن عبد الکریم بن عبد الرسول عفا اللہ تعالیٰ عنہم آمین انی اخذت القرآن العظیم علی جماعۃ وکذا الحدیث الشریف فاروی القرآن قراءۃ واجازۃ وسماعاً عن ائمۃ

منہم شیخنا و قدوتنا وسیدنا العلامہ الفقیہ المحدث القاری المتقن سیدی ابوالحسن علی بن عبد البر الونائی الحسینی وھو آخذ عن السید محمد مرتضیٰ ابی الفیض الحسینی الزبیدی ثم المصری وعن شیخ القراء والقراءت بالجامع الازھر ابی اللطائف عبد الرحمن بن عبداللہ بن محمد التیریری القرشی الاجھوری قالا رویناہ عن الشیخ المعمر محمد بن محمد الحسینی البلیدی زاد الثانی فقال وعن الفاضل المقریٔ المعمر شہاب الدین احمد ابی السماح بن احمد البقری قالا عن شیخ القراء بالدیار المصریۃ الشمس ابی عبد اللہ محمد بن القاسم بن اسماعیل البقری عن شمس الدین الباھلی عن خالہ سلیمان بن عبد الدائم الباھلی وغیرہ۔ عن نجم الدین ابی الاشراق محمد بن احمد بن علی السکندری عن شمس الدین محمد بن محمد بن عمر النشیلی عن قطب الدین محمد بن محمد عبد المتکبر عن الشمس محمد بن ناصر الدمشقی عن العماد ابی بکر بن ابراھیم بن ابی قدامۃ عن ابی عبد اللہ محمد بن جابر الوادی آلشی عن الامام ابی العباس احمد بن محمد الخزرجی الشہیر بابن الغماز عن ابی الحسن محمد بن احمد سلمون التسلبنی عن ابی الحسن علی بن محمد بن ھذیل عن ابی داؤد سلیمان بن نجاح الاموی عن ابی عثمان بن سعید بن عثمان الدانی عن فارس بن احمد الحمص عمرو عن عبد الباقی ابن الحسین المقری عن احمد بن سالم الختلی عن الحسن بن مخلد عن البزی عن عکرمۃ بن سلیمان عن اسماعیل بن عبد اللہ بن کثیر عن مجاھد عن عبد اللہ بن عباس عن ابی بن کعب عن رسول صلی اللہ علیہ وسلم قال ابی فلما بلغت والضحیٰ قال کبر حتی تختم مع خاتمہ کل سورۃ — وقد سمع منی الفاتحۃ وسورۃ الصف العلامہ ذوالاخلاق المرضیۃ الفہام المتصف بالشمائل السنیہ مولانا المولوی محمد اسحٰق بن محمد افضل الدھلوی واجزتہ بہما و بسائر القرآن بکل ما تجوز لی روایتہ وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔ حرر فی تاریخ ۲۶ فی شہر ذی الحجہ الحرام سنہ ۱۲۴۰ھ واجزت المولی المذکور بہذہ المناجات العظیمہ المنسوبۃ بسیدنا خضر علیہ السلام وھی۔

الٰہی قطرۃ من بحر جودک تکفینی وذرۃ من نثار عفوک تنجینی۔ وجرعۃ

من شراب شوقك تجيني۔ وجذبته من جذبات فيضك تهدیہ۔ الٰہی ارحم ارحم عبدك عبدك الخاطی الذليل الذی لم يوف بالعهود انك رحيم و ودود يا ارحم الراحمين۔ و صلی الله علی سيدنا محمد و آله و صحبه وسلم۔ ذكرها شيخنا السيد عبد الرحمن بن سليمان الاهدل مفتی زبيد عن الشيخ امر الله المزجاجی عن والده الشيخ عبد الخالق المزجاجی عن والده عن الخضر عليه السلام واسئل الله التوفيق وحسن الختام لی وللمسلمين وصلی الله علی سيدنا محمد وآله وصحبه وسلم

عمر بن
عبدالکریم بن
عبدالرسول

مسلسلات مولانا محمد اسحاق رح

بسم الله الرحمٰن الرحيم۔ قال العبد الضعيف محمد اسحاق اضافنا الشيخ فريد عصره عبد العزيز بالاسودين التمر والماء قال اضافنا الشيخ ولی الله بالاسودين۔ التمر والماء قال اضافنا شيخنا ابوطاهر بالاسودين التمر والماء قال اضافنا شيخنا محمد بن محمد بن سليمان المغربی البردانی نزيل مكته الشريفه بالاسودين التمر والماء قال اضافنی ابو عثمان سيدی سعيد بن ابراهيم الجزری عرف بقدوره بالاسودين التمر والماء قال اضافنی الشيخ الصدر الاوحدی سيدی احمد بن الحاج الوهرانی بالاسودين التمر والماء قال اضافنی الشيخ شيخ الانام موضحة طريقته۔

الاسلام ابو سالم سيدی ابراهيم التازی البليني بالاسودين التمر والماء قال اضافنی الشيخ العالم الولی ابو الفتح محمد بن ابی بكر بن الحسين المراغی المدنی بمنزلته بالمدينة تمرا وماء فی يوم الخميس شهر الحرام سنة احدی وثلثين وثمان و قرأ علينا اخبرنا الحافظ معين الدين سليمان بن ابراهيم الطوی اليمانی بقرائتی عليه تبعسر قال اخبرنی والدی اجازة قال اخبرنا النفيه تقی الدين عمر بن علی۔

الشعبی قال اضافنا شیخنا القاضی فخر الدین الطبری فی نزلتہ نزبید الاسودین التمر والماء قال اضافنا شیخنا الامام فخر الدین محمد بن ابراھیم الحتیری الفارسی علی الاسودین التمر والماء قال اضافنا شیخنا الحافظ ابو العلاء الصمدانی بھا علی الاسودین التمر والماء قال اضافنا الشیخ ابوبکر ھبۃ اللہ بن الفرج الکاتب المعروف بابن اخت الطویل الھمدانی علی الاسودین التمر والماء قال اضافنا ابو جعفر محمد ابن الحسین بن محمد بن ابراھیم الصوفی علی الاسودین التمر والماء قال اضافنی ابو الحسن علی ابن الحسن الواعظ علی الاسودین التمر والماء قال اضافنا ابو شیبہ احمد بن ابراھیم العطار المخرومی بالرران علی الاسودین التمر والماء قال اضافنا جعفر بن محمد بن عاصم الدمشقی علی الاسودین التمر والماء قال اضافنا نوفل بن الھاد علی الاسودین التمر والماء قال اضافنا عبد اللہ میمون الصاح علی الاسودین التمر والماء قال اضافنا جعفر بن محمد الصادق علی الاسودین التمر والماء قال اضافنا ابی محمد بن علی الباقر علی الاسودین التمر والماء قال اضافنا ابی علی ابن الحسین بن علی علی الاسودین التمر والماء قال اضافنی ابی قال اضافنی علی کرم اللہ وجھہ علی الاسودین التمر والماء قال اضافنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الاسودین التمر والماء قال من اضاف مومنا فکانما اضاف آدم وحوا ومن اضاف ثلثۃ فکانما اضاف جبرئیل ومیکائیل واسرافیل ومن اضاف اربعۃ فکانما قراء التوریت والانجیل والزبور والفرقان ومن اضاف خمسۃ فکانما صلے الصلوٰت الخمس فی الجماعۃ من یوم خلق اللہ الخلق الی یوم القیامۃ ومن اضاف ستۃ فکانما اعتق ستین رقبۃ من ولد اسماعیل ومن اضاف سبعۃ غلقت عنہ سبعۃ ابواب جھنم ومن اضاف عشرۃ کتب اللہ لہ اجر من صلی وصام وحج واعتمر الی یوم القیامۃ۔

منقول از حاشیہ الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین بر حاشیہ مسلسلات حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب۔

اعانتِ مجاہدین

۱۸۱۷ء میں دہلی سے جہاد کا جو غلغلہ بلند ہوا وہ ہر مسلمان کے دل کی پکار تھی بہت دن کے بعد اس صدا نے کانوں میں رس گھولا تھا۔ سادہ دل اور نیک طینت مسلمانوں کی اکثریت جیسے اس کے لئے گوش بر آواز تھی۔ پھر یہ تحریک شاہ ولی اللہ کے گھر سے اٹھی تھی اس لئے اس گھرانے کے سبھی افراد کے لئے یہ کوئی اجنبی اور اچانک بُلاوا نہیں تھا اور کسی بھی "ولی اللہی" کے لئے اس دعوت پر لبیک نہ کہنے کا بظاہر کوئی جواز نہیں تھا۔

مگر بات اتنی سادہ نہیں ہے

جہاد کی فرضیت اور اس میں کسی نوع کی بھی شرکت کے اجر و ثواب میں کلام کی کسی مسلمان کے لئے کیا گنجائش ہے؟ مگر اس حکم کے اطلاق کے سلسلہ میں تفاصیل میں اختلاف، بشرطِ حسن نیت کی پوری پوری گنجائش ہے۔ مثلاً جہاد کی وہ منزل جسے قتال کہتے ہیں اس کے سلسلہ میں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جس قوم کو ہدفِ قتال بنایا جا رہا ہے، کیا اس سے قتال شرعاً جائز ہے؟ قتال سے پہلے کے تمام مراحل طے ہو گئے؟ یا یہ کہ قتال کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہے، کیا اس کے مہیا ہونے تک جہاد کو مؤخر نہیں کیا جا سکتا؟ وغیرہ۔ صدہا سوالات پیدا ہو سکتے ہیں اور یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ ہر سوال نفاق بدنیتی اور ادائے فرض میں تساہل کا نتیجہ ہو۔

یہی صورت دہلوی تحریکِ جہاد کے ساتھ پیش آئی۔ اس تحریک میں اگرچہ کئی نامور علماء اور اہم شخصیتیں شریک تھیں مگر مرکزیت اور قیادت اور سیادت دو ہی حضرات کو حاصل تھی۔ (۱) حضرت سید احمد رائے بریلوی (۲) مولانا شاہ اسماعیل۔

سید صاحب رائے بریلوی ایک خانوادۂ سادات و صلحا کے ایک رکن تھے۔ غیر معمولی حساس، پُر جوش اور دردمند، فعال اور جسمانی طور پر قوی و توانا۔ تعلیم صرف، صرف و نحو تک حاصل کر سکے۔ مگر کتابی تعلیم کی کمی کسی حد تک گھر کے دینی ماحول اور پھر دہلی کے علمی ماحول نے پوری کر دی۔ شاہ عبد العزیز کی توجہ اور شاہ عبد القادر کے حسنِ تربیت نے

فطری صلاحیتوں کو جلا دی۔ بعض روحانی قویٰ بہت ترقی کر گئے اور شخصیت میں مقناطیسیت پیدا ہوگئی۔ افکار و آراء میں اعتدال و توازن تھا اور فروع و جزئیات میں رواداری، صرفِ نظر اور تحمل کا ثبوت دیتے تھے۔

مولانا محمد اسماعیل، شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے تھے اور شاہ عبدالقادر کے نواسِ داماد تھے۔ بچپن میں باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے تھے۔ اُن کے سوانح نگاروں نے اُن کے عہدِ طفلی اور عہدِ طالب علمی کے ایسے بہت سے واقعات جوشِ عقیدت میں اوراقِ تاریخ میں محفوظ کردیئے جن کی نفسیاتی توجیہ اس یتیمی اور محرومی کے اثرات کے سوا اور کچھ نہیں کی جاسکتی۔ ہم کر خود کو ان کے کسی عقیدت کیش سے کم تر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تحریکِ جہاد کے لئے ان کی ذاتِ گرامی مفید کم اور مضر زیادہ رہی اور اس دَور کی تاریخ میں ہمیں ان کی آواز پر لبیک کہنے والوں کی تعداد کم اور ان کے مسلک و مزاج کی وجہ سے تامل اور تذبذب کا شکار ہونے والوں کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔ احیاءِ سنن اور ردِّ بدعات کی اہمیت و افادیت اختلاف سے ماوراء ہے۔ مگر احوال و ظروف کا لحاظ اور مخاطب حلقہ کی قوتِ ہضم کی رعایت، حکمتِ تبلیغ کے اوّلین تقاضوں میں سے ہے ہم مسلسل اور نیازمندانہ اور معتقدانہ غور و فکر کے باوجود یہ سمجھنے سے قاصر ہیں، کہ شاہ اسماعیل نے عدمِ تقلید کی دعوت، اچانک اور برملا دعوت کے لئے اس وقت کا انتخاب کن دلائل کی بنا پر کیا تھا؟ اور ترغیبِ جہاد کے لئے "تقلیدِ شخصِ معین" کے خلاف تحریر و تقریر کی کونسی شرعی ضرورت تھی؟ ایک متفق علیہ رکنِ اسلام جہاد کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے مختلف فیہ مسائل و جزئیات پر ہنگامۂ اختلاف برپا کرنا ان کا ایک غیر حکیمانہ اندازِ دعوت تھا۔ پھر دعوت بھی ایسی پُرجوش کہ کراہت اور حرمت میں اور شرکِ خفی اور شرکِ جلی میں کوئی امتیاز نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ انہوں نے بعض مسائل بے وقت اور بے ضرورت چھیڑ کر دعوتِ جہاد کو متاثر کیا اور اُن کا طرزِ فکر و عمل سیّد صاحب کے طرزِ فکر و عمل سے مختلف تھا۔ یہ تفاصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے ورنہ انہیں کے معتقد مورخین کی تحریروں سے اس کا ثبوت پیش کیا جاتا۔ سید صاحب کو کئی بار ان کے پیدا کردہ ہنگاموں کو فرو کرنا پڑا اور اپنے

مصالحانہ اور واداراانہ طرزِ عمل کی وجہ سے اگرچہ مخالفت کے طوفانوں کو معتدل بناتے رہے مگر نتیجۃً سرحد کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کی اکثریت ان سے بیزار ہوتی چلی گئی اور دہلی اور اطراف کے مسلمانوں میں سے احناف کو بھی شرکتِ جہاد کے ولولہ کے باوصف اس تحریک میں شمولیت میں تامل ہونے لگا جو شریک ہو گئے تھے وہ لوٹنے لگے۔

اِن حالات میں مقدم و مؤخر کی تمیز اصل و فرع میں خطِ امتیاز کھینچنا اور اختلاف و اتفاق کی حدود کا تعین ہر سطح پر عقل و ہوش کے لوگوں کے بس میں نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عوام تو عوام ہیں خواص بھی اِس تحریک سے کنارہ کش نظر آتے ہیں۔ خواص میں بھی خانوادہ ولی اللٰہی کے منتسبین شاہ اسماعیل کے اس طرزِ فکر اور اندازِ تحریر و تقریر کی تلخیوں اور افتراق انگیزیوں کو برداشت نہ کر سکے اور تقریر و تحریر کے ذریعہ اور انکار و ابطال پر مجبور ہو گئے۔ شاہ اسماعیل کے حقیقی عم زاد بھائی مولوی مخصوص اللہ اور مولوی محمد موسیٰ ان مقابلہ آرا اور ابطال آمادہ علماء کے شانہ بشانہ صف آرا تھے۔ پھر مولانا صدر الدین آزردہ، علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا رشید الدین خان جیسے نیاز مندان سلسلۂ عزیزیہ اور رفقائے شاہ اسماعیل نے زبان و قلم سے شاہ صاحب کے حسنِ ادب سے معریٰ اور سوءِ ادب کے موہم الفاظ و عبارات اور مخالف سلف صالح افکار کا رد و ابطال کیا۔[1] نتیجۃً شاہ صاحب کی توانائیاں بھی ترغیبِ جہاد کے بجائے جواب اور جواب الجواب میں صرف ہونے لگیں۔

ایک اور افسوس ناک واقعہ یہ ہوا کہ خود ولی اللٰہی خاندان دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔ شاہ اسماعیل کے ساتھ مولوی عبد الحیٔ (داماد شاہ عبد العزیز) مولوی محمد یوسف (نبیرۂ شاہ اہل اللہ) وغیرہ تھے تو مولوی مخصوص اللہ اور مولوی محمد موسیٰ (ابنائے شاہ رفیع الدین) خلاف تھے۔ یہ دونوں مؤخر الذکر حضرات نہ صرف یہ کہ مناظرۂ دہلی میں مخالف گروہ کے

---

[1] حالانکہ خود شاہ شہید کے معتقد مورخین نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ لوگ استاد زادہ ہونے کی بنا پر شاہ اسماعیل کا احترام کرتے تھے اور انصاف پسندی کی بنا پر ان کے واقعی محاسن کا اعتراف کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ امیر الروایات، سوانح احمدی بعد الممات وغیرہ متعدد کتب میں یہ مذکور ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی نے شاہ صاحب کے محاسن کا اعتراف کیا تھا۔

ساتھ تھے بلکہ اس فتوے پر بھی ان کے دستخط ہیں جو شاہ اسماعیل کے خلاف لکھا گیا تھا۔

پورے خاندان میں جن دو قابلِ ذکر شخصیتوں نے اتفاق و اختلاف کی حدود کو پہچانا، اصول اور فروع میں امتیاز کیا تو وہ شاہ محمد اسحاق اور اُن کے بھائی شاہ محمد یعقوب تھے۔

ہم آئندہ حوالوں کے ساتھ یہ ثابت کریں گے کہ وہ حنفی تھے اور شاہ اسماعیل سے قطعاً متفق نہیں تھے۔ مختلف معاشرتی رسوم کے باب میں بھی ان کا طرزِ فکر فقیہانہ تھا، مبلّغانہ اور خطیبانہ نہیں تھا۔ وہ مکروہ کو مکروہ اور حرام کو حرام کہتے تھے۔ وہ متشدّد و متصلّب بھی نہیں تھے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ شاہ اسماعیل مکروہ کو حرام کہہ رہے ہیں اور حرام کو شرک۔ وہ یہ بھی سُنتے تھے کہ شاہ اسماعیل مسلک تقلید پر مسلسل تحریم کا حکم لگا رہے ہیں مگر اس کے باوجود انھوں نے دعوتِ جہاد پر لبیک کہنے سے اپنے کسی شاگرد، مرید اور عزیز و خویش کو نہیں روکا۔ بلکہ مجاہدین کی ہر طرح اور ہر پہلو سے اعانت، حمایت و رفاقت فرماتے رہے۔ جناب مہر نے لکھا ہے:[1]

"سیّد صاحب نے فراہمی زر کے جو مراکز بنائے تھے ان میں سب سے بڑا مرکز دہلی میں تھا جس کے انتظام کے ذمّہ دار شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب تھے۔" مگر یہ شاہ محمد اسحاق کی خدمات کا فراخدلانہ اعتراف نہیں ہے۔ اوّلاً تو یہ صحیح نہیں ہے کہ "فراہمی زر کے مراکز جا بہ جا بنائے گئے تھے۔" سید صاحب سرحد جاتے وقت اپنی پوری جماعت کو سمیٹ کر لے گئے تھے۔ سرحد جا کر "سید صاحب کو (مولوی محبوب علی کی واپسی کے بعد) خیال ہوا کہ ہندوستان کے ملکوں میں ہادی بھیج کر حق کی ترویج کرانی چاہیئے۔ چنانچہ سید محمد علی رامپوری اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی اس کام کے لئے تجویز ہوئے۔"[2] یہ ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء کا قصہ ہے۔ اس سے پہلے کہاں کہاں مراکز تھے؟ پھر ان حضرات کے نام کسی اہم معاملہ میں کوئی خط نہیں ہے۔ اصل میں مراکز ہمارے خیال میں صرف تین تھے! ٹونک، دہلی اور سندھ۔ باقی حضرات سفیر تھے۔

خود مہر صاحب کی اپنی کتابوں سے یہ ثابت ہے کہ ان دونوں بھائیوں کے ذمّہ صرف فراہمیِ زر نہیں تھی، بلکہ تصحیح خیال، مخالفانہ ہنگاموں کو فرو کرنا، پورے ملک سے آنے والے

---

[1] جماعتِ مجاہدین ص۵۳ [2] تذکرہ صادقہ از مولوی عبدالرحیم صادق پوری۔ طبع ۱۳۲۰ھ

قافلوں کی ضیافت، ان کے سفر کا انتظام، راستوں کا تعین، مختلف ہدایات، حد یہ ہے کہ کتابوں کی اشاعت تک میں شاہ محمد اسحاق نے حصہ لیا۔

سید صاحب کے ساتھ شاہ اسماعیلؒ نے تقریباً ۱۸۱۷ء (۱۲۳۲ھ) میں ایک مختصر ہنگامہ آرا رسالہ تقویۃ الایمان کے نام سے تحریر کیا تو اس کی اشاعت سے ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس کے انداز بیان اور لہجہ کی روش اور تلخی نے شاہ عبدالعزیز و شاہ عبدالقادر کے بہت سے تلامذہ و خدام کو دل آزردہ اور مایوس کیا۔ چنانچہ اس کے خلاف رسائل لکھے گئے، تقریریں کی گئیں، مناظرے ہوئے اور ان سب کے نتیجہ میں شاہ اسماعیل نے اس رسالہ میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت محسوس کی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مرید امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ ہم بہ تفصیل اس کا ذکر کریں گے۔ امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ[1]

مولوی اسماعیل صاحب نے تقویۃ الایمان اول عربی میں لکھی تھی .... اس کے بعد مولانا نے اس کو اردو میں لکھا اور لکھنے کے بعد اپنے خاص خاص لوگوں کو جمع کیا جن میں سید صاحب، مولوی عبدالحیٔ صاحب، شاہ اسحاق صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولوی فرید الدین صاحب مرادآبادی، مومن خاں، عبداللہ خاں علوی اور مولانا مملوک العلی بھی تھے۔ اور ان کے سامنے تقویۃ الایمان پیش کی اور فرمایا۔ میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور میں جانتا ہوں اس میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آ گئے ہیں اور بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً ان امور کو جو شرکِ خفی تھے شرکِ جلی لکھ دیا ہے .....
اگر آپ حضرات کی رائے ہو تو اشاعت کی جائے ورنہ اسے چاک کر دیا جائے۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ اشاعت تو ضرور ہونی چاہیئے ــــ مولوی عبدالحیٔ، شاہ اسحاق صاحب، عبداللہ خاں علوی اور مومن خاں نے مخالفت کی اور کہا ترمیم کی ضرورت نہیں۔

ہمیں اس بیان کے ہر جز کی صحت پر یقین نہیں ہے مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ شاہ محمد اسحاق اس بزم میں شریک ہوئے تھے اور انہوں نے مشورہ میں حصہ لیا تھا جو ایک نوع کی اعانت ہے۔

مولوی عبدالرحیم صادق پوری لکھتے ہیں۔

---

[1] تذکرۂ صادقہ (طبع ۱۳۴۰ھ) ص۱۱۶ مولفہ مولوی عبدالرحیم صادق پوری۔

مولانا ولایت علی نے شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نبیرہ[1] مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ دہلوی کی خدمت میں ترجمۂ قرآن از شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور رسائل مولانا شاہ اسماعیل شہید کے ارسال کی درخواست کی اور جناب شاہ صاحب کے ارسال فرمانے پر پہلے مطبع حسینی لکھنؤ میں ان کے طبع کرانے کی سعی فرمائی۔ سید افکار صاحب مطبع آپ نے زمانۂ دور دوسیر بنگال کے اِس خدمتِ طبع کو اپنے خلیفہ مولوی بدیع الزماں بردوانی کے حوالہ فرمایا۔ چنانچہ مولوی صاحب موصوف نے ایک ٹائپ پریس قیمتی دس ہزار خرید کر بہ کرات ومرات تفصیل ارشاد کیا۔

شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمۂ قرآن تو ظاہر ہے کہ مختلف فیہ نہیں تھا لیکن شاہ شہید کے رسائل تو مختلف فیہ تھے۔ کم از کم شاہ اسحاق کو ان سے اتفاق نہیں تھا۔ مگر جب شاہ شہید کے ایک معتقد کو وہ اشاعت کے لئے مطلوب ہوئے اور انہوں نے شاہ اسحاق کو واسطہ بنایا تو انہوں نے حاصل کر کے روانہ کر دیئے۔ رواداری اور فراخ دلی کا یہ انمول نمونہ ہے۔

سید صاحب کے ایک ساتھی مولوی سید محبوب علی بعض اختلافات کی بنا پر ایک جماعت کے ساتھ سرحد سے واپس آگئے تھے۔ ان کی مراجعتِ دہلی سے ترغیبِ جہاد کی سرگرمیاں بہت متاثر ہوئی تھیں۔ پورے ملک میں اس جماعت کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں عام ہو گئیں اور زرِ اعانت کی فراہمی اور مجاہدین کے قافلوں کی روانگی بھی مسدود ہو گئی۔ تحریکِ جہاد کے لئے یہ بڑی کٹھن گھڑی تھی۔ یہ صورتِ حال اگر کچھ دن اور جاری رہتی تو جہاد کو جاری رکھنا ممکن نہیں رہتا کیونکہ سید صاحب اور ان کے تمام بااثر رفقا سرحد اور اصل مرکز و میدانِ جہاد میں تھے۔ ملک میں بقول جناب مہرؔ "جابجا جو مراکز" سید صاحب نے قائم کئے تھے اور بعض حضرات کو داعی بنا کر سرحد سے ملک میں واپس بھیجا تھا ان میں کوئی بااثر، باحوصلہ اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والی شخصیت نہیں تھی۔ اس کٹھن گھڑی میں شاہ اسحاق و شاہ یعقوبؒ کے اثرات کام آئے اور ان دونوں بھائیوں نے جانے کن کن تدبیروں سے اس طوفان کا رُخ پھیرا۔ منشی محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں۔[2]

---

[1] نبیرہ (پوتا) نبیسہ (نواسہ) [2] سوانح احمدی طبع کراچی ص ۲۳۶

مولوی محبوب علی کے اغوا سے جو کاروبارِ جہاد کو صدمہ پہنچا ویسا صدمہ اس لشکر کو آج تک کسی سکھ یا درّانی کے ہاتھ سے نہ پہنچا تھا۔ مولوی محبوب علی کے فتنہ کے بعد مدت تک ہندوستان سے قافلوں کا آنا بند ہو گیا۔ اکثر معاونینِ جہاد سُست ہو گئے۔ جب بہت سے خطوط مولوی محبوب علی کی تکذیب میں لشکرِ مجاہدین سے ہندوستان میں آئے تب مدّتوں کے بعد مولوی محمد اسحاق صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب معاونینِ جہاد کی سعی سے یہ فتنہ محبوبی رفع ہو کر خرچ اور قافلوں کی روانگی دوبارہ شروع ہوئی۔"[1]

اِس قضیہ میں مزید نزاکت یوں پیدا ہو گئی تھی کہ شاہ اسماعیل نے سرحد سے ایک خط لکھ کر دہلی بھیج دیا جس میں مولوی محبوب علی کے متعلق حسبِ عادت نالائم اور درشت الفاظ استعمال کئے تھے۔ شاہ اسحاق نے اس خط سے مولوی محبوب علی کو لاعلم رکھنے کی کوشش کی مگر ان کو علم ہو گیا اور سیّد صاحب کے قاصد پیر محمد نے وہ خط مولوی محبوب علی کو دکھا دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے اُن کا برہم ہو کر اپنی مخالفانہ سرگرمیوں کو تیز کر دینا فطری تھا۔ مگر شاہ اسحاق نے اس گرداب سے بھی کشتی کو صحیح و سالم نکال لیا۔

پورے ملک سے جو مجاہدین آتے تھے وہ دہلی ٹھہر کر وہاں سے راستہ اور زادِ راہ کے سلسلہ میں ہدایات اور سیّد صاحب کے نام پیغام لے کر آگے بڑھتے تھے۔ سرحد سے بھی جو فرد یا قافلہ آتا وہ دہلی شاہ اسحاق کے پاس آتا تھا۔ مولوی سید جعفر علی نقوی اپنے سفرِ سرحد کی داستان میں لکھتے ہیں[1] کہ وہ ~~۱۲۴۳ھ~~ ۱۲۴۵ھ[2] میں ۲۱ آدمیوں کے قافلہ کے ساتھ بستی (یو۔پی) سے سرحد کے لئے روانہ ہوئے اور راہ میں دہلی پہنچ کر شاہ اسحاق سے ملے

---

[1] منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء ص۱۳۵

[2] یہاں ایک تاریخی تصحیح ضروری ہے۔ مہر صاحب نے ان کو پنجتار (سرحد) پہنچنے کا سن ۱۲۴۵ھ لکھا ہے۔ میرے سامنے منظورۃ السعداء کا جو مخطوطہ (کتب خانہ سعیدیہ ٹونک) رہا ہے اور جس کا بڑا حصہ خود مولوی جعفر علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اس میں بھی پہلے ۱۲۴۵ھ ہی لکھا تھا (چہل و پنج) مگر اس کو کاٹ کر سشش بنایا ہے ص۹۲ اور یہ مولوی جعفر علی ہی کا خط ہے۔ کتب خانہ سعیدیہ میں منظورہ کے کئی نسخے تھے۔ میں نے ۱۹۴۳ء میں اسی نسخہ سے استفادہ کیا تھا۔ متعدد نوٹس لئے تھے۔ مہر صاحب کے پیشِ نظر جو نسخہ تھا معلوم ہوتا ہے اس میں کاتب نے یہ تنسیخ نظرانداز کر دی یا مولف کو اس کی کتابت کے بعد تنبہ ہوا اور اپنے مسودہ میں تو ترمیم کر دی مگر نقول میں نہ کر سکے۔

اور ارادہ ظاہر کیا کہ دہلی میں چند خرید لوں۔ شاہ صاحب نے رفقاء سے مشورہ کے بعد ان سے کہا کہ تمہارے پاس صرف سو روپیہ زادِ راہ ہے۔ یہاں تک تو دعوتوں اور نقد اعانتوں کے سہارے پہنچ گئے مگر آئندہ سفر میں یہ سہولتیں نہیں مل سکیں گی اِس لئے یہ رقم محفوظ رکھو۔ حادثۂ بالاکوٹ کے بعد وطن واپس جاتے ہوئے بھی وہ دہلی میں چودہ۱۴ روز مقیم رہے اور شاہ اسحاق و شاہ یعقوب سے ملاقاتیں کرتے رہے۔

۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء میں سید صاحب نے سرحد سے اپنا ایک قاصد پیر محمد دہلی بھیجا۔ وہ دہلی پہنچ کر شاہ اسحاق کی درس گاہ میں مقیم رہا[۱] دہلی سے جب سرحد واپس ہونے لگا تو راستہ میں سکھوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ رہا ہوا تو دہلی لوٹ آیا اور پھر سرحد جانے پر مصر ہوا تو شاہ اسحاق نے فرمایا[۲]

"بے شک تم جاؤ مگر ہم کوئی ہنڈی اس وقت تک نہیں بھیج سکتے جب تک قطعی طور پر یہ معلوم نہ ہو جائے کہ سید صاحب نے (سرحد میں آج کل) کہاں اقامت اختیار کی ہے؟"

شیخ محمد اسحاق گورکھپوری جہاد میں شرکت کے لئے سرحد جاتے ہوئے دہلی پہنچے تو وہ بھی شاہ اسحاق کے پاس مقیم رہے۔[۳]

زرِ اعانت جمع کرنے کے سلسلہ میں بھی ان دونوں بھائیوں نے بڑی جد و جہد کی۔ مولوی نصیر الدین دہلوی جو شاہ اسحاق صاحب کے بھائی بھی تھے، شاگرد بھی اور داماد بھی خود کہتے تھے کہ جب شاہ صاحب وعظ فرمایا کرتے تھے تو میں مدرسہ کے دروازے پر کھڑا لوگوں سے چندہ جمع کیا کرتا تھا[۴] جب معتدبہ رقم جمع ہو جاتی تھی تو یا تو سرحد سے کوئی قاصد آکر روپیہ لے جاتا۔ جسے کبھی نو روپیوں کی اشرفیاں بنوا دی جاتیں اور انہیں کپڑوں میں اس طرح سی دیا جاتا کہ کسی کو خبر نہ لگ سکے۔ کبھی روپیوں کی ہنڈی بنوا دی جاتی[۵] ایک بار ہنڈی کے سلسلہ میں عدالت تک جانے کی بھی نوبت آگئی تھی کیوں کہ[۶]

"ایک ہنڈی سات ہزار روپیہ کی بذریعہ ساہوکاران دہلی مرسلہ مولوی محمد اسحاق صاحب بنام

---

[۱] جماعتِ مجاہدین صفحہ ۹۲ [۲] ایضاً صفحہ ۹۶ [۳] ایضاً صفحہ ۱۷۱ [۴] سرگزشت صفحہ ۱۳۶ [۵] جماعتِ مجاہدین صفحہ ۹۳، ۹۱
[۶] سوانح احمدی صفحہ ۱۶۵۔

سید صاحب روانہ ہوئی تھی۔ ملک پنجاب میں وصولی نہ ہونے پر اس سات ہزار روپیہ کا دعوے عدالتِ دیوانی میں دائر ہو کر ڈگری ہوئی اور پھر ہنگام اپیل عدالت عالیہ دیوانی (ہائی کورٹ) آگرہ میں بھی حکم ڈگری بحق مدّعی بحال رہا۔ سر سید[1] لکھتے ہیں:۔ دہلی کے ایک ہندو مہاجن نے جس کے پاس جہادی لوگوں کی امداد کے واسطے روپیہ جمع کیا گیا تھا امداد کے روپیہ میں کچھ تغلب کیا اور مسٹر ولیم فریزر بہادر متوفی کمشنر دہلی کے روبرو اس پر نالش ہوئی اور انجام کار مولوی محمد اسحاق صاحب مدعی کے حق میں اس دعوے کی ڈگری ہوئی اور جو روپیہ مدعا علیہ سے ڈگری کا وصول ہوا وہ اور ذریعہ سے سرحد بھیجا گیا اور اسی مقدمہ کی اپیل صدر کورٹ الہ آباد میں ہوئی وہاں سے بھی عدالتِ ماتحت کا فیصلہ بحال رہا۔

ہنڈی کے سلسلہ میں سید صاحب نے شاہ صاحب کو حسب ذیل خط لکھا تھا۔[2]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از امیر المومنین سید احمد

بخدمت بابرکت صاحبزادہ والاتبار مولانا محمد اسحاق صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد از سلام مسنون دعائے اجابت مقرون واضح آں کہ بتاریخ دہم ماہ رمضان (؟) ہنڈوی مبلغ ہفت ہزار و نہ صد و پنجاہ روپیہ دریں جا رسید لیکن بجز پرچۂ کاغذ یک خرمہرہ رسید موجبش دریافت نیست لازم است کہ بسبب تعویق آں نگارند۔ زیادہ والسلام مع الاکرام

اِس خط کا اجنبیانہ اور کاروباری و دفتری اندازِ تحریر ظاہر کر رہا ہے کہ یہ عدالت میں پیش کرنے کے لئے لکھا گیا ہے ورنہ سید صاحب کے جو خطوط ان دونوں بھائیوں کے نام آتے تھے وہ عربی میں ہوتے تھے (صرف یہ خط فارسی میں تھا) دو خطوں کے سوا باقی تمام خطوط میں کاتب اور مکتوب الیہما کے نام صراحۃً نہیں لکھے جاتے تھے۔ سید صاحب اپنا نام مثلاً اس طرح لکھتے تھے:۔ "من عبداللہ المنتہن لاعلاء کلمۃ اللہ" اور مکتوب الیہما (دونوں بھائیوں) کے نام مثلاً اس طرح:۔ "الی کریم الاخلاق طیب الاعراق فاتح الاغلاق و الی اخیہ المحبوب ذی الخلق المرغوب" یوں ہی رقم کی رسید بھی رمز و اشارہ لکھی جاتی تھی۔ مثلاً سات سو روپیہ کی رقم کے

---

[1] مقالاتِ سر سید حصّہ نہم طبع لاہور ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۲۳ [2] سوانح احمدی (مکتوبات سید احمد شہید) صفحہ ۲۹۵ طبع کراچی مکاتیبِ احمد شہید صفحہ ۱۲۵ مکتبہ رشیدیہ لاہور ۱۹۷۵ء

متعلق لکھا تھا۔ "مرتبۂ ثالثہ میں اقلیموں کی تعداد کے مطابق"۔

اب ہم جہاد میں شرکت کی ایک دوسری شکل پیش کرتے ہیں۔ اب تک جو تفاصیل کی گئیں وہ اعانتِ مجاہدین کی تھیں، لیکن ایک ایسا وقت بھی آیا جب اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر معرکۂ جہاد کا بازار گرم کیا جب وہ سرد پڑ چکا تھا۔

۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے میدان میں سید صاحب، شاہ محمد اسماعیل اور دوسرے اکابرِ جماعت کی شہادت کے حادثے نے تحریک کو بہت متاثر کیا تھا۔ جماعت کی تنظیم ایک شخص کی عقیدت پر استوار ہوئی تھی۔ ایک شخص اور اس کے اہلِ علم اور صاحبِ رائے رفقاء کی شہادت کے بعد جماعت کا منتشر، دل شکستہ اور پست ہمت ہو جانا فطری تھا۔ مجاہدین کی ہمتیں بلند اور ولولے تازہ رکھنے کے لئے سید صاحب کی شہادت کو غیوبت کا رنگ دیا گیا۔ جماعت کے نئے سربراہ کا انتخاب بھی کیا گیا مگر کوئی تدبیر مؤثر ثابت نہیں ہوئی اور جماعت وہ مقام حاصل نہ کر سکی جو سید صاحب کی حیات میں اسے حاصل تھا۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد تقریباً سات سو مجاہد بچے تھے ان میں بہت سے مجاہدین ہندوستان واپس آ گئے حتیٰ کہ نئے امیر منتخب شیخ ولی محمد پھلتی بھی سید صاحب کے اہل و عیال کو (جو سندھ میں مقیم تھے) لیکر ہندوستان واپس آ گئے۔[1] کچھ نے جہاد کا ارادہ ترک کر کے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ باقی مجاہدین نے جذبۂ جہاد کو بیدار رکھا مگر نہ اُن کو جائے پناہ اور مستقل اقامت گاہ میسر تھی نہ کسی صاحب الرائے امیر کی قیادت نہ جہاد کا کوئی ہدف ہی متعین تھا (کہ کس کے خلاف جہاد کریں)

مہر صاحب نے سرگذشت مجاہدین میں ص ۱۲۸ تک ان کی جو سرگذشت ۱۲۴۶ھ سے

---

[1] شیخ ولی محمد پھلتی کے متعلق ہم نے ایک مفصل مضمون لکھا ہے جو اس کتاب کے ضمیموں میں شامل ہوگا۔ شیخ صاحب کے متعلق ہماری معلومات ذاتی ہیں۔ جناب مہر نے ان کے ذکر میں ناکافی معلومات کی بنا پر بہت سی غلطیاں کی ہیں وہ ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء میں نواب وزیر الدولہ کی دعوت پر سندھ سے سید صاحب کے اہل و عیال کو لے کر مولوی خیر الدین شیرکوٹی اور شیخ وجیہ الدین باغپتی کے ساتھ ٹونک چلے گئے تھے۔ ہمارے پاس وہ خط ہے جو وزیر الدولہ نے ان حضرات کو لکھا تھا مہر صاحب کے ماخذ میں منظورہ بھی تھی جس کی بیشتر روایات شیخ ولی محمد سے لی گئی ہیں۔ مگر تعجب ہے مہر صاحب اُن کی ٹونک کی زندگی کا تذکرہ نہیں کرتے۔ ان کے پڑپوتے شفاء الملک مولوی حکیم سید ظہیر احمد برکاتی ابن مولوی نصیر احمد بن مولوی عبد الرب بن شیخ ولی محمدؒ ماشاء اللہ ٹونک میں معروف و مصروف ہیں۔ ف ۲ فروری ۱۹۸۷ء۔

۱۲۵۴ھ تک کی لکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد جماعتِ مجاہدین (تقریباً سات سو حضرات) میں سے ساٹھ ستر حضرات ریاست بہار چلے گئے اور چھ سوا چھ حضرات کوہانہ، پھر دونوں مقامات کے رفقا پنجتار منتقل ہو گئے۔ پنجتار سے ناوا گئی، امب، اگرور اور جتی کوٹ سے ستھانہ پہنچے۔ جہاں مولوی نصیر الدین منگلوری کی شہادت پر سلسلۂ جہاد منقطع ہوا۔ ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء۔ مجاہدین کی ایک تعداد ٹونک چلی گئی۔ ایک تعداد اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئی۔ ایک قلیل تعداد ستھانہ میں مقیم ہو گئی۔

ٹھیک اسی دَور میں شاہ اسحاق جہاد میں اپنا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ جب انہوں نے سرحد میں ہنگامۂ جہاد سرد ہوتے دیکھا تو اپنے بھائی، شاگرد اور داماد مولوی نصیر الدین[2] کو میدانِ جہاد میں کود پڑنے کے لئے آمادہ و مستعد کیا۔ مولوی سید نصیر الدین اب تک مجاہدین کے لئے زرِ اعانت شاہ اسحاق کے اجتماعاتِ وعظ میں جمع کیا کرتے تھے اب وہ ہجرت کے لئے کمربستہ ہو گئے اور ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء میں گھر سے روانہ ہو گئے اور مرکزِ جہاد ۱ (دہلی) سے چل کر مرکز ۲ (ٹونک) ہوتے ہوئے مرکز ۳ (سندھ) پہنچے۔ سندھ میں مختلف علماء، مشائخ، امراء سے ملاقاتیں کر کے اپنی ترغیبِ جہاد کی اور مشورے لئے۔ بالآخر مزاری بلوچوں کے ساتھ مل کر ان کے از دست رفتہ علاقے واپس دلانے کے لئے روجھان کے مقام پر سکھوں سے جہاد کیا اور روجھان کو سکھوں سے واپس لے لیا (۱۲۵۳ھ/۱۸۳۸ء) مگر جب مزاری بلوچ مسلمانوں نے سکھوں سے صلح کر لی اور والئی بہاولپور نواب بہاول خاں اور سندھ کے حکام کی بھی مرضی نہ دیکھی تو ترکِ سکونت کر کے مہرو جا کر اقامت اختیار کر لی پھر وہاں سے بھی بلوچستان کے کئی مقامات پر عارضی طرح اقامت ڈالتے ہوئے افغانستان پہنچ گئے اور امیر دوست محمد خاں والئی کابل کی حمایت میں انگریزوں سے لڑے اور اس لڑائی میں غزنی میں مولوی صاحب کے بہت سے رفقا شہادت پا گئے۔ (۲۱ر جولائی ۱۸۳۹ء، ربیع الاول ۱۲۵۵ھ) تو مولوی صاحب اور ان کے بقیۃ السیف

---

[1] منشی محمد جعفر تھانیسری نے تو حادثۂ بالاکوٹ پر ہی اس سلسلہ کو ختم کر دیا ہے۔ اور شیخ ولی محمد اور مولوی نصیر منگلوری کی ہفت سالہ سرگرمیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا اور دوسرا دور ۱۲۶۱ھ میں مولوی ولایت علی کی سرگرمیوں سے شروع کیا۔

[2] ان کے مفصل حالات اخلافِ شاہ اسحاق کے باب میں ملاحظہ ہوں۔

رفقاءِ جہاد و ہجرت ستھانہ منتقل ہو گئے اور وہیں ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۱ء میں وفات پائی۔[1]

یہ تھا شاہ اسحاق کے بھائی، شاگرد اور داماد مولوی نصیر الدین دہلوی کی ان مجاہدانہ سرگرمیوں کا اجتماعی تذکرہ، جو انہوں نے شاہ اسحاق کی ہدایت پر ان کی حمایت و قیادت میں تقریباً چھ سال کیں۔ اِس عرصہ میں مولوی سید نصیر الدین مسلسل شاہ اسحاق سے رابطہ قائم کئے رہے۔ چنانچہ طرفین سے برابر مراسلت رہی۔[2]

مختصر یہ ہے کہ شاہ اسحاق نے تحریکِ جہاد میں نیم دلانہ اور عارضی نہیں نمایاں اور مسلسل حصہ لیا۔ ان کی حیثیت دہلی میں مجاہدین کے امین اور خزانچی کی نہیں، ایک رکنِ رکین، معتمدِ خاص اور مختارِ عام کی تھی۔ وہ میدانِ جہاد میں نہیں گئے مگر مسلسل شریکِ جہاد رہے۔ وہ شاہ اسماعیل کے نظریات اور اندازِ نظر سے اختلاف رکھتے تھے۔ مگر سید احمد شہید سے عملاً متفق تھے۔

ہجرت و وفات

شاہ اسحاق نے ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء سے ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۲ء تک مسلسل گیارہ سال تحریکِ جہاد کی سرپرستی اور اعانت کی تاکہ برعظیم جو صدیوں سے دارالاسلام رہا تھا اور اب دارالحرب ہو گیا تھا پھر سے دارالاسلام ہو جائے، لیکن ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں اچانک انہوں نے دارالحرب سے ہجرت کرنے کا عزم فرما لیا۔

اِس کے کیا اسباب تھے؟ کیا وہ اب شرعاً ہجرت کو فرض سمجھ رہے تھے؟ یعنی اب برعظیم کو اُن کے خیال میں دوبارہ دارالاسلام بنانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا؟ اِس لئے وہ دارالاسلام کو ہجرت کر جانا چاہتے تھے۔

یا اس میں جذبات اور ذاتی و شخصی حالات کو دخل تھا؟

ہمارے خیال میں اس کا کوئی شرعی پہلو نہیں تھا۔ کیونکہ نہ اس سلسلہ میں آپ کا کوئی فتویٰ نظر سے گذرا نہ کوئی قول اس خصوص میں آپ سے منقول ہے۔ پھر اگر آپ برعظیم سے

---

[1] مگر ایک روایت یہ ہے کہ مولوی صاحب نے بھی غزنی کے ہی معرکہ میں شہادت پائی۔ تازہ نوارِ مبارک ص۲۹۷ مرتبہ آغائے جیبی ۱۹۵۹ء کراچی۔ [2] سرگزشتِ مجاہدین صفحہ ۱۵۱ و ۱۷۵۔

ہجرت کو شرعاً واجب سمجھ رہے تھے تو تمام اعزا، تلامذہ، مسترشدین کو بھی یہ ہدایت فرماتے اور جو لوگ اِس ہدایت پر عمل نہ کرتے اُن سے قطع تعلق اور ترکِ موالات فرمالیتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کے ایک داماد، مولوی عبدالقیوم جو آپ کے ساتھ مکہ معظمہ گئے تھے کچھ دن، کے بعد برِعظیم واپس لوٹ آئے تھے۔ نیز آپ کے مخصوص تلامذہ مولانا قطب الدین خاں، قاری عبدالرحمٰن، مولانا مظفر حسین کاندھلوی نے بھی ہجرت نہیں کی تھی اور ان حضرات سے آپ کے تعلقات آخر تک خوش گوار رہے۔

لامحالہ آپ کا یہ عزم ذاتی اور شخصی نوعیت کا ہوگا۔ مرکزِ اسلام میں مستقل قیام کا جذبہ ہر مسلمان کی طرح آپ کے قلب میں بھی موجزن ہوگا۔ سفرِ حج میں زیارتِ حرمین کے بعد اس میں اور شدت پیدا ہو گئی ہوگی۔ موانع اور عدم وسائل سدِّ راہ ہوں گے پھر سفرِ حج سے لَوٹے تو وطن میں آوازۂ جہاد بلند ہو چکا تھا۔ یہ بھی گویا ان ہی کے دل کی پکار تھی۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء تک مجاہدین کا ساتھ دیتے رہے اور اس کے بعد جہاد کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لے لی اور اب امیرِ جہاد مولوی سید نصیر الدین دہلوی تھے۔ مگر جب ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء میں ان کی جماعت کا شیرازہ بکھر گیا اور ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۱ء میں وہ خود وفات پا گئے جو ان کے لئے ذاتی طور پر بھی ایک حادثہ تھا تو وہ مایوس ہو گئے ہوں گے اور اس سرزمین سے ان کا دل اُچاٹ ہو گیا ہوگا اور مرکزِ اسلام حجاز ہجرت کر جانے کی دیرینہ آرزو پھر جاگ اٹھی ہوگی اور اس آرزو نے انہیں آمادۂ ہجرت کر دیا ہوگا۔

سرسید کے بیان سے بھی ہمارے قیاس کی تائید ہوتی ہے۔[1]

ازبس کہ شعائرِ اسلام میں ضعف اور رسومِ کفر و بدعت میں قوت آگئی۔ نیتِ ہجرت کی کرکے تمام قبائل کو ہمراہ لے کر راہیِ مکہ معظمہ ہوئے اور باوصفے کہ تمام سکنائے شہر اور سلطان وقت بہ سماجت مانع[2] آئے مگر چونکہ شوقِ ماہوالحق غالب تھا آپ ممتنع نہ ہوئے۔

---

[1] آثار الصنادید ص۲۷۵ طبع کراچی۔ [2] اگر شاہ صاحب اس ہجرت کو شرعاً واجب سمجھ رہے ہوتے تو اہلِ شہر میں سے کس کو جرأت تھی کہ مانع آتا؟

قاری عبدالرحمٰن پانی پتی نے بھی ہجرت کے وقت میاں نذیر حسین سے جو گفتگو شاہ صاحب کی نقل کی ہے[1] اس سے بھی جھنجھلاہٹ کا پتہ چلتا ہے۔ میاں صاحب نے جب شاہ صاحب سے درخواست کی کہ کسی کو آپ جانشین بنا جائیں تو شاہ صاحب نے غصہ سے فرمایا "کونسی خدمتِ بادشاہی میں رکھتا تھا جو اپنا جانشین کر جاوٴں؟"

بہرحال شاہ صاحب نے دہلی سے مکہ معظمہ ہجرت کر جانے کا عزم فرما لیا اور مدرسہ رحیمیہ سے اور اس طرح شہر دہلی سے باہر نکل کر چار روز قطب صاحب میں قیام فرمایا۔ قاری عبدالرحمٰن صاحب کا بیان[2] ہے کہ

"رؤسائے شہر بھی بطور رخصت کے وہاں حاضر تھے" مرزا محمد بیگ دہلوی نے لکھا[3] ہے کہ حضرت نے عزم ہجرت فرمایا تو

تمامی علماء و رؤسا نیز حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تا درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ بمعیت آں حضرت رفتند و مرخص گردانیدند از صدمۂ مفارقت آں مجمع البرکات تمامی اہل ایں دیار مغموم بودند و ہر صغیر و کبیر از دردِ فراق آں یگانہ دل گیر و ملول بود۔

تمام علماء و رؤساء دہلی نیز حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہ اللہ کی درگاہ تک حضرت کے ساتھ گئے اور آپ کو رخصت کیا۔ آپ کی جدائی کے صدمہ سے اس شہر کے تمام باشندے مغموم تھے اور آپ کی جدائی کے رنج سے ہر چھوٹا و بڑا دل گرفتہ و ملول تھا۔

سرسید کا بیان آپ پڑھ آئے ہیں کہ "رؤسائے شہر اور سلطانِ وقت مانع آئے"[4]

مولانا محمد یعقوب نانوتوی[5] نے لکھا ہے کہ جب شاہ صاحب نے ۱۲۵۷ھ میں اچانک ارادۂ ہجرت کیا اور ذی قعدہ میں شاید روانہ ہو گئے۔ دہلی میں اندھیرا ہو گیا اور آپ صاحبوں کے ساتھ ایک بڑا قافلہ عرب کو روانہ ہوا۔

---

[1] کشف الحجاب ص۶ [2] ایضاً [3] مقدمۂ فتاویٰ عزیزی از مرزا محمد بیگ دہلوی ص۱۲ مگر مؤلف حیات بعد الممات نے لکھا ہے کہ پہلی منزل نظام الدین میں تین روز قیام فرمایا ص۵۹۔ [4] کشف الحجاب ص۶
[5] مقدمہ فتاویٰ عزیزی ص۱۲ [6] رسالہ حالات مولانا محمد قاسم نانوتوی ص۶

آپ کے رفقائے ہجرت میں سے آپ کے اہلِ بیت میں سے چھوٹے بھائی محمد یعقوب، تینوں بیٹیاں، اہلیہ شاہ محتشم اللہ پھلتی، اہلیہ مولوی عبدالقیوم پھلتی اور اہلیہ مولوی سید نصیر الدین دہلوی ساتھ تھیں۔ پہلی دونوں صاحبزادیوں کے شوہر اور بچے بھی تھے۔ تیسری صاحبزادی ابھی چند ماہ قبل بیوہ ہوئی تھیں۔ ان کے شوہر مولوی نصیر الدین دہلوی نے چند ماہ قبل ہی دار الہجرت (ستھانہ) میں وفات پائی تھی اور بہت ممکن ہے انہی کی وفات کے غم نے شاہ صاحب کا شوقِ ہجرت متحرک کیا ہو۔ اہلِ بیت کے علاوہ بھی آپ کے ساتھ بہت سے حضرات تھے جنہیں مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے ایک "بہت بڑا قافلہ" اور سرسید نے "تمام قبائل" لکھا ہے۔

شاہ صاحب دہلی سے حرمین کو جاتے ہوئے باندہ ہوتے ہوئے تشریف لے گئے تھے۔ مولانا حالی نے لکھا ہے۔

۱۸۵۸ء میں جب حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب ہجرت کے ارادہ سے حرمین شریفین کو جانے لگے اس وقت مولانا مرحوم (قاری عبدالرحمٰن پانی پتی) بھی ان کے ہمراہ تھے۔ چوں کہ مرحوم ذوالفقار الدولہ بہادر نواب باندہ نے شاہ صاحب سے درخواست کی تھی کہ حرمین کو اس طرف سے تشریف لے جائیں۔ اس لئے شاہ صاحب اول باندہ تشریف لے گئے اور مولانا مرحوم (قاری صاحب) کو نواب ذوالفقار الدولہ بہادر کے پاس باندہ چھوڑ گئے تھے۔ (نقوش لاہور فروری مارچ ۶۲ء)

شاہ صاحب اپنے خاندانی کتب خانہ کی خاص خاص اور نادر و نایاب کتابیں بھی ساتھ لے گئے تھے۔ عام کتابیں یہیں چھوڑ گئے تھے۔ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کا بیان ہے کہ

جو کتابیں بہت پسندیدہ تھیں وہ شاہ اسحاق مرحوم بروقتِ ہجرت اپنے ساتھ لیتے گئے تھے اور وہ وزن میں نو من تھیں۔ باقی کتابیں ان کے ایما سے میں نے اور نواب قطب الدین خاں نے ہراج کر دی تھیں۔ (مقالاتِ شروانی صفحہ ۲۸)

حکیم مومن خاں نے شاہ صاحب کی تاریخ ہجرت اس طرح کہی ہے۔[1]

آں مبنیٔ دین و جانِ اسلام ‏ ‏ ‏ ‏ عرفاں مصور و مجسم
از کشورِ ہند رخت بربست ‏ ‏ ‏ ‏ بیزار، ز کافران مجسم

[1] "مومن" از کلب علی خاں فائق رامپوری صفحہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۲ء (بحوالہ مخطوطہ دیوان مومن مخزونہ رضا لائبریری رامپور)

اندیشۂ سال ہجرت او | بر چرخ مہاجر و مکرم
ہم چشم مقربانِ حق ہیں | ہم راز فرشتگانِ محرم
فرمود وحیدِ عصر اسحاق | بر حکم شہنشہِ دُو عالم
بگذاشتہ دار حرب امسال | جا کردہ بمکۂ معظم

اِس قطعہ سے استخراج سالِ تاریخ کے سلسلہ میں خان بہادر مولوی بشیر الدین لکھتے ہیں[1]

"وحید عصر اسحاق" کے اعداد "مکہ معظمہ" کے اعداد کے ساتھ ملاؤ اور "دار حرب" کے اعداد سے خارج کر دو تو ۱۲۶۰ھ سال ہجرت کا نکلتا ہے"

مگر ۱۲۶۰ھ لکھنا صحیح نہیں ہے۔ "وحید عصر اسحاق" کے اعداد ۵۵۸ ہوتے ہیں اور "مکہ معظمہ" کے ۱۱۱۵ ہیں دونوں کا حاصل جمع (۵۵۸ + ۱۱۱۵ = ۱۶۷۳) ہوتا ہے۔ اس میں سے "دار حرب" کے اعداد ۴۱۵ نکال دیئے جائیں تو ۱۲۵۸ باقی رہتے ہیں۔ ۱۶۷۳-۴۱۵ = ۱۲۵۸-اور یہی سالِ ہجرت ہے۔

خواجہ احسن اللہ کا قطعۂ تاریخ ہجرت

مولوی اسحاق صاحب فخرِ دیں | تھا منوّر شہر جن کے نام سے
درس فرماتے تھے ہفتہ میں دُو بار | فہم سے، ادراک سے، الہام سے
عالم و جاہل سبھی چھوٹے بڑے | بہرہ ور تھے ان کے فیضِ عام سے
کر گئے ہجرت مع اہل و عیال | سوئے کعبہ، شوق کے احرام سے
سچ تو یوں ہے جو کہ احسن نے کہا | شہر خالی ہو گیا اسلام سے

مصرعِ آخر سے سوائے "اسلام" کے تاریخ نکلتی ہے۔ (۱۲۵۸ھ)[2]

میر ظہور علی:-

مولوی اسحاق صاحب باکمال | ترک خانہ کردہ سوئے کعبہ رفت
سالِ تاریخش چنیں گفتہ ظہور | یک ہزار و دو صد و پنجاہ ، ہشت[3]

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم صفحہ ۴۲۵

[2] و[3] احکام العیدین، نواب قطب الدین خاں، مطبع نولکشور ۱۲۶۱ھ۔

افسوس ہے کہ آپ کی قبلِ ہجرت کی زندگی کی طرح آپ کے مکی عہدِ حیات کے حالات بھی ضبطِ تحریر میں نہیں لائے گئے۔ بہت کم حالات معلوم ہو سکے ہیں۔ سرسید لکھتے ہیں۔[1]

"(مکہ معظمہ میں) بسبب کثرتِ کرم آپ کا کیسہ ہمیشہ خالی رہتا تھا خصوصاً ان لوگوں کی مراعات (مدارات) کے سبب سے جو ہندوستان سے ادائے حج کو وارد مکہ شریفہ ہوئے تھے، وہاں کے لوگوں نے حضرت کے وجودِ مطہر کو از جملہ مغتنمات سمجھا اور ان کا وہاں ہونا موجبِ برکت جانا۔" مکہ معظمہ کے محلہ شامیہ کے جس مکان میں قیام تھا وہ اب تک ان کے اخلاف کی تولیت میں ہے۔[2]

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے جو ان کے داماد و شاگرد مولوی سید نصیر الدین دہلوی سے بیعت تھے اور پھر سال ۱۲۶۱ھ میں مکہ معظمہ میں اُن سے ملے تھے، فرمایا[3]

محمد اسحاق صاحب مکہ معظمہ میں اپنے مکان پر دن کو پڑھایا کرتے تھے اور مغرب کو کوئی طالب علم آوے تو تربیتِ درویشی میں مصروف رہتے تھے۔

عبداللہ سراج مکی، حنبلی مصلے کی جگہ پر کر (خالی تھی) درس دیتے تھے۔ شاہ محمد اسحاق صاحب ان کے درس میں ایک ستون سے لگ کر کھڑے رہتے تھے۔ بعد فراغ درس کے عبداللہ سراج، شاہ صاحب کی طرف تشریف لاتے تھے۔ شاہ صاحب آگے بڑھ کر ملتے تھے۔ عبداللہ سراج آپ کا ہاتھ پکڑ کر لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتے تھے۔ یہ ہندوستان کے بہت بڑے عالم ہیں اور بڑی تعریفیں کرتے تھے۔

حضرت حاجی صاحب شاہ اسحاق کے متعلق عبداللہ سراج کی رائے نقل کرنے کے بعد عبداللہ سراج کے متعلق شاہ صاحب کی رائے بھی نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ایک بار شاہ اسحاق سے میں نے یا مولوی رحمت اللہ صاحب نے پوچھا کہ عبداللہ سراج بڑے عالم ہیں یا شاہ عبدالعزیز صاحب؟ آپ نے جواب دیا دینیات میں تو عبداللہ سراج صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب سے بڑھے ہوں گے، ہاں دوسرے علوم میں شاہ صاحب بے شک زائد ہیں۔

---

[1] آثار الصنادید طبع کراچی ص ۲۷۵ [2] بیان اعزہ بھوپال
[3] شمائم امدادیہ ص ۱۲۲ [4] مقالاتِ طریقت ص ۲۳۹

دوسرے فنون کا اس ملک میں رواج و چرچا کم ہے اور ان لوگوں کو دیگر فنون کی طرف میلان نہیں پھر یہ لوگ اس میں کیسے کمال حاصل کر سکتے ہیں؟

حضرت حاجی صاحب نے شاہ صاحب کے وصایا بھی نقل کیے ہیں جو شاہ صاحب نے ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ میں فرمائے تھے۔ فرماتے ہیں۔[1]

وصایا شاہ صاحب نے چند وصایا فرمائے۔ ازاں جملہ یہ کہ اپنے کو کمترین مخلوقات سمجھنا چاہیئے اور یہ کہ تا امکان خود قوتِ حرام و مشتبہ سے پرہیز واجب جانے کہ لقمۂ حرام مشتبہ سے برابر نقصان ہے اور مراقبۂ الم تعلم بان اللہ یری تعلیم فرمایا تاکہ ملاحظہ معنی صورت رویت حق تعالیٰ خود کو ملاحظہ کرے اور اس پر مواظبت رکھے تاکہ وجدان صورتِ ملکیہ کا ہووے اور دوسری باتیں تعلیم فرمائیں اور اپنے خاندان کے معمولات کی اجازت دی اور فرمایا فی الحال بعد زیارتِ مدینہ طیبہ تمہارا ہند کو جانا قرینِ مصلحت ہے پھر تو انشاء اللہ تمام تعلقات منقطع کر کے اور بہ ہمت یہاں آؤ گے۔ البتہ چندے صبر ضروری ہے۔

ایک دوسرے موقع پر یوں فرمایا۔

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نے مجھ کو چار چیزیں تلقین فرمائیں۔ (۱) طلب رزق حلال (۲) تمام عالم سے اپنے کو کمتر سمجھنا (۳) مراقبہ (۴) ترک اختلاط غیر جنس۔

مکہ معظمہ میں برعظیم کے جن علماء نے آپ سے فیض حاصل کیا ان کا ذکر ہم تلامذہ کے باب میں کریں گے۔ حجاز کے جن علماء نے آپ سے بیعت کی اور استفاضہ کیا اُن میں شیخ محمد بن ناصر الحازمی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔[2] مکہ معظمہ میں ان کو سبق پڑھایا کرتے تھے اور بعد مغرب کوئی طالب علم آوے تو تربیتِ درویشی میں مصروف رہتے۔ (مقالاتِ طریقت ص ۲۳۹)

اور آپ کے اشراقِ باطن کا یہ حال تھا کہ سبق میں اکثر اشخاص مختلف المزاج کچھ دلوں میں سوالات سوچ کر آتے تو سب لوگ اپنے اپنے سوال و جواب کی تقریر حضرت کی زبانِ مبارک سے تفسیر و وضاحت سے پڑھانے میں سن لیتے۔ (مقالات ص ۲۳۹)

---

[1] شمائم امدادیہ ص ۱۱۹۔ [2] نزہۃ الخواطر الجزء السابع ص ۵۱ و ۵۲۔

وفات مکہ معظمہ میں تقریباً تین سال آٹھ ماہ قیام کے بعد وبائے عام میں روزہ کی حالت میں یک شنبہ رجب سنہ ۱۲۶۲ھ (سنہ ۱۸۴۵ء) میں آپ نے وصال فرمایا اور سیدتنا حضرت خدیجہ ام المومنین (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے مزارِ مبارک کے پاس مدفون ہوئے۔[1] شیخ عبداللہ سراج نے آپ کو غسل دیا۔ غسل دیتے وقت شیخ کہتے تھے۔[2]

واللہ انہ لو عاش[3] وقرات علیہ الحدیث طول عمری مانلت ما نالہٗ	بخدا شاہ صاحب اگر زندہ رہتے اور میں اُن سے زندگی بھر حدیث پڑھتا تو بھی مجھے وہ مقام حاصل نہ ہوتا جو انہیں حاصل تھا۔

مولوی غلام سرور صاحب خزینۃ الاصفیا نے حسبِ ذیل قطعۂ تاریخ وفات موزوں کیا۔

شیخ اسحاق، رہبرِ آفاق	آں کہ ذاتش بدو جہاں طاق ست
دل بسالِ وصالِ او مسرور	گفت اسحاق شیخ آفاق ست
	۱۲۶۲ھ

متفرق حالات

جاگیر عبدالرحیم[4] ضیا کا بیان ہے کہ شاہ عبدالعزیز کے تین موضع جاگیر میں تھے۔ ان کی سند شاہ عالم بادشاہ اور دولت راؤ سندھیا نے گذرانی تھی۔ حسن پور اور مراد آباد، پرگنہ سکندر آباد سے چاروں بھائیوں میں مشترک اور ایک موضع یعنی محل مجنہ پرگنہ بڈھانہ سے بلا شرکتِ غیرے آپ کے تصرف میں تھا۔ چنانچہ وہ موضع اپنے دونوں نواسوں یعنی مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب کو عطا کیا تھا اب تک جاری ہے۔ مولوی نصر اللہ خاں صاحب کہتے ہیں کہ میری عمل داری میں محل مجنہ کے سالانہ بارہ سو روپے کلدار ہوتے تھے اور اب بھی وہی ہے۔ ارواحِ[5] ثلثہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جاگیر انگریزوں نے ضبط کرلی تھی

ایک بار یہ دونوں بھائی غیر معمولی طور پر مسرور دیکھے گئے۔ کسی کے سوال پر شاہ اسحاق نے

---

[1] نزہۃ الخواطر الجزء السابع ص۵۲ والیانع الجنی ص۱۶۱۔ [2] اتحاف النبلا مولانا شمس الحق دہانوی بحوالہ نزہۃ الخواطر ص۵۲

[3] ۱۲۶۴ھ میں خود شیخ سراج بھی وہیں پہنچ گئے۔

[4] مقالاتِ طریقت ص۲۳۔ [5] ارواحِ ثلثہ ص۶۹

فرمایا۔ حسن پور میں جو زمین داری تھی۔ سرکار (کمپنی) نے اسے ضبط کرلیا ہے اور معاش کا جو ظاہری ذریعہ تھا وہ ختم ہوگیا۔ اب صرف خدا پر بھروسہ رہ گیا۔

حُلیہ سرسید کا بیان[۵۱] ہے کہ حق جل و علیٰ نے صورت و سیرت دونوں عطا کی تھیں آپ کی صورت سے آثار صحابیت ظاہر ہوتے تھے اور یقین ہوتا تھا کہ سید الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا فیض جنہوں نے پایا ہوگا اُن کی یہی صورت و سیرت ہوگی۔ آنکھیں[۵۲] بڑی بڑی اور حسین تھیں۔ زبان میں لکنت تھی۔ سراپا سے معصومیت ہویدا تھی۔ لوگ "فرشتوں کی سی صورت" کہا کرتے تھے۔ ہمیشہ نظریں نیچی رکھتے تھے۔ لوگوں کو تمنا تھی شاہ صاحب کی آنکھیں جو بہت خوبصورت تھیں، دیکھیں مگر تمام عمر نہ دیکھ سکے۔ راستہ چلتے تو بھی نگاہیں نیچی رہتیں، اور نہایت فروتنی کے ساتھ چلتے مگر محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ راستہ میں جو دیکھتا بغیر دست بوسی کئے نہ رہتا۔ دوکاندار اپنی اپنی دوکانیں چھوڑ کر آتے اور مصافحہ کی سعادت حاصل کرتے۔

عُرف شاہ صاحب کا عرف بڑے میاں تھا اور شاہ یعقوب کا چھوٹے میاں۔[۵۳]

نظام الاوقات تہجد پڑھ کر تھوڑی دیر کے لئے سو جاتے۔ صبح کی نماز مسجد میں باجماعت ادا کرتے پھر گھر چلے جاتے اور لڑکیوں کو تعلیم دیتے۔ سورج دو نیزے بلند ہوتا تو درس گاہ میں تشریف لاتے اور دوپہر تک تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس دیتے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے لئے قیلولہ فرماتے۔ نماز ظہر مسجد میں ادا کرنے کے بعد پھر درس کا سلسلہ شروع ہو جاتا جو بعد مغرب تک جاری رہتا۔ بیچ میں صرف نماز عصر کے لئے تھوڑی دیر ملتوی ہوتا مغرب کی نماز کے بعد گھر جاتے لیکن جلد ہی واپس لوٹ کر آجاتے اور نماز عشار تک طلبہ کو مختلف کتابیں پڑھانے کے بعد نماز عشار پڑھ کر استراحت فرماتے۔[۵۴]

سخاوت بسبب کثرتِ کرم آپ کا کیسہ ہمیشہ خالی رہتا تھا۔ (سرسید) جب یہ (شاہ اسحاق) اجمیر پہنچے اور مجاور (درگاہ کے خدام) پیچھے لگے تو آپ نے فرمایا تم اس وقت میرے پاس آؤ۔

---

[۵۱] تذکرہ اہل دہلی ص ۱۸۔ [۵۲] ارواح ثلثہ ص ۱۲۵ و مقالات طریقت ص ۲۴۔ [۵۳] ارواح ثلثہ ص ۱۳۲
[۵۴] فیض روح قدسی از مولوی نجف علی بحوالہ جماعت مجاہدین، غلام رسول مہر ص ۳۱۳۔

پہلے ہم زیارت کرلیں۔ جب زیارت کر کے اپنی قیام گاہ پر پہنچیں تو اس وقت ہمارے پاس آنا۔ مجاوروں نے ایسا ہی کیا اور آپ کی قیام گاہ پر پہنچے۔ اس وقت آپ نے مجاوروں کو بلا کر اور لپیں بھر بھر کر روپے دیئے۔ اس وقت مجاوروں نے کہا۔ اِن کو کون وہابی کہتا ہے ایسا تو اب تک کوئی بھی نہیں آیا صرف فلانی بیگم آئی تھیں سو اس نے بھی اتنا نہیں دیا۔[1]

خدمتِ خلق خلق اللہ کی حاجت روائی کے سلسلہ میں سفارش بھی بڑی فراخدلی سے فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ نواب فرخ آباد کو ایک سال میں ایک ہزار سفارشی خط لکھے۔ انہوں نے ہر خط کی تکمیل کی۔ آخر مجبور ہو کر عرض کیا۔ آپ کے سفارشی والا نامے اس سال ایک ہزار پہنچے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ واقعی آپ کو بہت تکلیف ہوئی مگر میں سفارش کئے بغیر نہیں رہ سکتا تم میری تحریروں پر عمل نہ کیا کرو۔[2]

اخلاص فی التعبد شاہ صاحب کو بواسیر کا مرض تھا۔ کسی شخص نے اس کے ازالہ کے لئے آیاتِ قرآنی پڑھنے کا عمل بتایا مگر شاہ صاحب نے یہ عمل نہیں کیا۔ مولوی مظفر حسین کاندھلوی اور نواب قطب الدین خاں نے اصرار کیا تو فرمایا اوّل تو ہم نیک عمل نہیں صرف ٹوٹے پھوٹے فرض اور سنتیں پڑھ لیتے ہیں ان میں بھی ہم خواہشِ نفسانی کو داخل کردیں اور عبادت کو عمل بنالیں یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔[3]

طلبہ کی خدمت مولوی اعلم (عالم؟) علی صاحب کو اپنے طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ تین وقت کا فاقہ ہوا۔ جب یہ شاہ صاحب سے سبق پڑھنے بیٹھے تو اُن کی آواز میں کمزوری پائی گئی۔ شاہ صاحب سمجھ گئے کہ یہ بھوکے ہیں آپ فوراً مکان میں تشریف لے گئے اور کھانا لائے اور مولوی اعلم صاحب کو الگ بلا کر کھانا کھلایا اور اس دن سے ان کا کھانا اپنے یہاں کر لیا۔[4]

نِعم الفقیر شاہ عبدالعزیز سے ہر ایک ریزیڈنٹ ملنے آیا کرتا تھا۔ شاہ صاحب اس کے لئے مونڈھے بچھوا دیا کرتے تھے، وہ نذرانہ پیش کرتا تھا۔ شاہ صاحب

---

[1] ارواحِ ثلثہ صد۵۵ [2] ایضاً صد۱۵۵ [3]، [4] ایضاً صد۱۳۶

موسم کا پھل اس کے لئے بھجوادیا کرتے تھے۔جب شاہ صاحب کی وفات ہوگئی تو سب نے مل کر حضرت شاہ اسحاق صاحب کو (ان کا جانشین) مقرر کیا اور ان کو نذرانے دیتے حتیٰ کہ سید صاحب (سید احمد شہید) بایں جلالتِ قدر نذر پیش فرماتے۔شاہ صاحب مدرسہ میں پڑھا رہے تھے کہ ریزیڈنٹ آیا۔لیکن شاہ صاحب نے نہ اس کو دیکھا، نہ اُن کی مجلس میں کوئی تغیر آیا۔شاہ صاحب ہمیشہ نگاہیں نیچی رکھتے تھے۔بعض کی یہ تمنا تھی کہ شاہ صاحب کی آنکھیں جو خوبصورت تھیں دیکھیں مگر تمام عمر نہ دیکھ سکے۔غرض کہ ریزیڈنٹ مدرسہ میں آیا اور ٹہلتا رہا۔جب درس ختم ہوا تو شاہ صاحب کے پاس آکر بوجہ پتلون کے ٹانگ پھیلا کر بیٹھ گیا۔تھوڑی دیر میں رخصت ہونے لگا تو شاہ صاحب نے فرمایا۔مجھے معلوم ہے کہ شاہ صاحب (عبدالعزیز) مرحوم آپ کے پاس ہدیۃً کچھ بھجوایا کرتے تھے مگر میرے پاس کچھ ہے نہیں کہ بھجواتا۔جب ریزیڈنٹ چلا گیا تو بعض مسلمانوں نے ہی یہ کہہ کر شاہ صاحب کی طرف سے بدظن اور مشتعل کرنا چاہا کہ دیکھئے وہ حضور سے کیسی بے التفاتی سے پیش آئے وہ متکبر ہوگئے ہیں۔اس پر ریزیڈنٹ نے انہیں ڈانٹا اور کہا کہ خاموش! کہ میں اس شاہ کا امتحان لینے گیا تھا کہ (اسی بوریئے) پر بیٹھ کر دنیا سے کتنا مستغنی ہے؟ [1]

معصومیت | حضرت شاہ (عبدالعزیز) صاحب مغفور فرمایا کرتے تھے کہ اگر معصومیت کا اطلاق سوائے پیغمبروں کے دوسرے پر جائز ہوتا تو اس وقت میاں اسحاق پر ہوتا۔[2]

عملیات | ایک طالب علم کو جن کا آسیب تھا۔ایک روز اس طالب علم سے جن نے کہا کہ میں تجھ کو جمعہ کے روز یہاں سے اُٹھا لے جاؤں گا۔یہ کیفیت حضرت (شاہ عبدالعزیز) سے عرض کی۔مولانا محمد اسحاق کو ارشاد ہوا کہ تم اس کا کچھ بند و بست کردو کہ وقتِ موعود ٹل جائے پھر دیکھا جائے گا۔اُن دنوں مولانا (شاہ اسحٰق) کو عملیات کا شوق تھا انہوں نے طالب علم کو ایک جا بٹھلا کر اس کے اطراف زمین پر دائرہ کھینچا۔آپ دائرے کے باہر چھڑی لے کر بیٹھے رہے۔تماشا دیکھنے کے واسطے بہت لوگ مدرسہ میں جمع ہوئے۔حاصلِ کلام سوا پہر

---

[1] ارواحِ ثلاثہ ص۱۳۸ [2] مقالاتِ طریقت ص۲۳۷۔ہمارا حسن ظن یہ ہے کہ شاہ صاحب کے اس قول کا انتساب صحیح نہیں ہے۔شاہ صاحب جیسے بزرگوں سے ان کا علم و تقویٰ احتیاط کا مقتضی ہے معصومیت کا مشروط اطلاق بھی خلافِ احتیاط ہے۔

دن کے قریب ایک شے مثل ہاتھی کی سونڈ کے آسمان سے اُترنے لگی۔ اُترتے اُترتے اس طالبعلم کے سر کے قریب ہوگئی۔ مولانا اسحاق صاحب نے دائرے کے اندر کود کر ایک چھری اس کے ماری، وہ سونڈ آپ کے ہاتھ سے لپٹ گئی اور چھری سے ہاتھ زخمی ہوا۔ آپ بہتیرا چھڑاتے تھے مگر وہ نہ چھوڑتی تھی۔ اِتنے میں حضرت (شاہ عبدالعزیز) نے تشریف فرما ہو کر فرمایا کہ تو یہاں سے جاتا ہے یا تیرے بادشاہ سے کہا جائے۔ فوراً اس کلام کے سنتے ہی وہ غائب ہوگئی۔ اس روز سے وہ طالب علم اچھا ہوگیا۔[۱]

حاضر جوابی مولانا رشید احمد گنگوہی کا بیان ہے[۲] کہ ایک مولوی حضرت شاہ اسحاق صاحب کا مخالف تھا۔ اس کو کچھ ضد ہوگئی تھی کہ شاہ صاحب جو کچھ فرماتے اس کی تردید کرتا۔ ایک دن اس نے شاہ صاحب کی خدمت میں کہلوا بھیجا کہ یاد رکھنا جس چیز کو تم حرام کہو گے میں اُسے حلال بتاؤں گا اور جسے تم حلال بتاؤ گے میں اسے حرام بتاؤں گا۔ شاہ صاحب نے بے ساختہ فرمایا "ہم تو اس کی ماں کو اس پر حرام کہتے ہیں وہ حلال کہہ دے"۔ اس جواب کو سن کر مولوی صاحب دم بخود رہ گئے۔

بواسیر قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کا بیان ہے کہ
ایک دفعہ میاں صاحب بواسیر کے سخت دَورے میں مبتلا ہوگئے تھے۔ چھ ہفتے تک ایک عالمِ یاس رہا۔[۳]

اخلاف

شاہ محمد یعقوب دہلویؒ

شاہ محمد اسحاقؒ کے صرف ایک بھائی تھے جو آپ کے ہم خیال و ہم مسلک اور زندگی بھر آپ کے رفیق و شریکِ حال رہے۔ اسمِ گرامی محمد یعقوب اور عرف چھوٹے میاں تھا۔ ولادت ۲۸ ذی الحجہ سنہ ۱۲۰۰ھ۔ علوم کی تحصیل و تکمیل شاہ رفیع الدین محدث دہلوی

---

[۱] مقالاتِ طریقت ص۶۷۔ [۲] مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، تذکرۃ الرشید ص۲۲۲ حصہ دوم۔
[۳] مقالاتِ شروانی (نواب حبیب الرحمٰن شروانی) ص۲۸ علی گڑھ سنہ ۱۹۳۴ء۔

سے کی۔ سند شاہ عبدالعزیزؒ سے حاصل کی۔ فراغت کے بعد اپنے بزرگوں کے مدرسہ میں درس دینے لگے۔ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ فریضۂ حج ادا کیا۔ واپسی پر بھی درس کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں یہ پورا گھرانہ ہند کے دارالحرب سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلا گیا۔ وہاں بھی درس وارشاد کا سلسلہ جاری رہا۔ ۴۲ برس جوارِ بیت اللہ میں قیام کے بعد ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۷ء کو آپ نے وصال فرمایا۔

آپ سے علومِ دینیہ اور فیضِ باطن حاصل کرنے والوں میں سے نواب صدیق حسن خاں، مولانا مظفر حسین کاندھلوی، مولانا عبدالعزیز جعفری، مولوی عبدالقیوم بڈھانوی حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد زماں خاں (شہید ۱۲۹۲ھ) شیخ محمد محدث تھانوی اور خواجہ احمد بن یاسین نصیر آبادی، مولانا سید غوث علی شاہ پانی پتی مولوی محمد سعید عظیم آبادی وغیرہ ہیں۔

مولف سوانح احمدی نے آپ کو سید احمد شہید سے مستفید اور اُن کا خلیفہ لکھا ہے۔ یہ اگرچہ عقلاً مستبعد نہیں ہے مگر مولف سوانح احمدی نے شاہ عبدالعزیزؒ کے گھرانے کے بارے میں اس قدر غلط بیانیاں کی ہیں کہ بغیر سند اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

شاہ محمد یعقوب کو اگرچہ شاہ اسماعیل کے طرزِ فکر اور مسلک سے اتفاق نہیں تھا مگر ان بزرگوں کے اختلافات حدود میں محدود ہوتے تھے۔ چنانچہ ادھر طرفین میں معاشرتی روابط خوش گوار تھے، ادھر خاص تحریکِ جہاد بالکفار میں شاہ محمد یعقوب اور ان کے برادرِ مکرم نے ممکن اعانت کی۔ امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ شاہ اسماعیل نے حج کو روانہ ہونے سے قبل خاص خاص علماء کی ایک مجلس طلب کی تھی جس میں شاہ محمد یعقوب بھی شامل تھے۔ ان حضرات کے سامنے شاہ اسماعیل شہید نے تقویۃ الایمان کے اندازِ بیان کے سلسلہ میں مشورہ کیا تھا۔

مجاہدین کی ہجرت کے بعد ہندوستان میں اعانتِ مجاہدین کا کاروبار انہی دونوں بھائیوں نے سنبھالا تھا۔ پورے ملک سے جو قافلے آتے وہ انہی دونوں بھائیوں سے مشورہ کر کے اور ہدایات لے کر آگے بڑھتے۔ سرحد سے جو ہدایات آتیں وہ انہی بھائیوں کے توسط سے

آتیں۔ زرِ اعانت کی فراہمی اور اسے مجاہدین تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی انہی کی تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سید صاحب کے متعدد خطوط ان حضرات کے نام ہیں۔ خطوط جن حالات میں لکھے جاتے تھے اور قاصد جن راستوں سے گزرتے تھے ان کی وجہ سے کاتب اور مکتوب الیہ کے اسماء صراحۃً نہیں لکھے جا سکتے تھے اس لئے القاب عموماً اس قسم کے ہوتے تھے۔

"شیخین جلیلین للدرایۃ عینین و للروایۃ اذنین وللساحۃ یدین وللشہادۃ عضدین وللعبارۃ قدامین وللہدایۃ مسلمین اما اکبرھما فلاریب فی انہ شجرۃ غائرۃ الاصول والاعراق ناضرۃ الغصون والاوراق واما اصغرھما فلاتک فی انہ ثمرۃ طعمہا مرغوب درجہا محبوب"۔ یا:۔ الی کریم الاخلاق طیب الاعراق فاتح الاغلاق والی اخیہ المحبوب ذی الخلق المرغوب" یا:۔ ناصران بکلمۃ اللہ ناصحان لدین اللہ اما اکبرھما فلاتک انہ نقی الاعراق صفی الاخلاق وصی الآفاق واما اصغرھما فلا ریب انہ ذوالخلق المرغوب مطہرادناس العیوب"۔ "مکاتیب سید احمد شہید" میں آپ کے نام ۱۴ مکاتیب ہیں ایک فارسی میں اور ۱۳ عربی میں، ایک مکتوب (۳۲) کے آخر میں چند سطور فارسی میں ہیں۔ تمام خطوط سید صاحب کی طرف سے مگر مکتوب ۲ کے آخر میں شاہ اسماعیل کی طرف سے بھی چند سطور ہیں۔

مولوی نصیر الدین کے ایک خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ محمد یعقوبؒ کا کبھی سندھ کی ہجرت کا ارادہ تھا کیونکہ وہ لکھتے ہیں۔ "برائے مہاجرت بھائی یعقوب ملک سندھ بسیار خوب است"۔

سید صاحب کے مجاہدین میں سے ایک گروہ مولوی سید محبوب علی کی قیادت میں بغاوت کر کے جب سرحد سے لوٹ آیا تھا اور دہلی میں تحریکِ جہاد کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھا تو تحریکِ جہاد بہت متاثر ہو گئی تھی ادھر مادی اعانت بند ہو گئی تھی۔ اس فتنہ کو رفع کرنے اور دوبارہ یہ سلسلہ شروع کرنے کا سہرا انہی دونوں بھائیوں کے سر ہے۔

افسوس ہے کہ ان دونوں بھائیوں کو نظر انداز اور فراموش کر دینے اور ان کی خدمات کو بھلا دینے کی منظم و متحدہ سعی کی گئی ہے۔ اس لئے ان حضرات کے سوانح کے صرف چند گوشے بمشکل اوراقِ تاریخ پر محفوظ رہ گئے ہیں۔ سسرال، اولاد، تصانیف، مسترشدین و مستفیدین

غرض پوری زندگی کو اوجھل کر دیا گیا ہے ورنہ ان دونوں برادرانِ کرام کا مرتبہ اس سے ظاہر ہے کہ شاہ ولی اللہ نے جو پیش گوئی کی تھی کہ "اگرچہ میرے فرزند بھی مبارک ہیں اور ان میں نیکی ظہور پذیر ہوگی۔

مگر تدبیر غیب کا تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو اور ہستیاں پیدا ہوں گی جو مدتوں مکہ اور مدینہ میں دینی علوم کی ترویج کریں گی اور وہیں رہیں گی اور یہ دونوں ہستیاں اپنی ماں کے رشتہ سے مجھ سے متعلق ہوں گی۔"

تو نواب صدیق حسن خان کے بقول اس عبارت کے مصداق شاہ عبدالعزیزؒ کے دونوں نواسے شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب ہوسکتے ہیں۔ ان دونوں نے دہلی سے ہجرت کی، مکہ میں اقامت پذیر ہوئے۔ وہاں سالہا سال تک علمِ حدیث کا درس دیا اور عرب و عجم ان سے فیض یاب ہوئے۔

سرسید نے اپنے دور کے جن خاصانِ دہلی کے تذکرے سے اپنی کتاب آثار الصنادید کے ابواب کو زینت دی تھی ان میں شاہ محمد یعقوب بھی تھے۔ لکھتے ہیں۔

"علم و فضل میں بھی پایہ کم نہیں رکھتے تھے اور خلقِ جمیل و صفاتِ جزیل اور قناعت و استغنا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی بطریقِ ہدیہ و پیش کش کچھ لایا کبھی قبول نہ کیا۔ جو سرمایہ اپنے پاس رکھتے ہیں اس میں بسر اوقات کرتے ہیں خواہ بہ تنگی اور خواہ بہ وسعت اور حسبِ استعداد اپنے مال کی زکوٰۃ نکالتے رہتے ہیں اور کم استعدادی میں توفیق ایسے امورِ خیر کی ایسے ہی مردانِ خدا کا کام ہے۔ آپ نے ہمراہ اپنے برادرِ مرحوم کے ہندوستان سے ہجرت کی اور مکہ معظمہ میں وطن اختیار کیا۔ جب تک شاہجہاں آباد رہے گوشۂ عزلت یا بر دامن رہتے تھے اور ابنائے روزگار کی طرف کبھی رجوع نہ رکھتے تھے۔ اور یہی حال ہے اس بلاد میں بھی کہ کچھ وجہ قلیل میں جو کسی کسبِ حلال سے بہم پہنچا ہے اپنی اوقات گذر کرتے ہیں اور اوقاتِ شبانہ روزی کو عبادتِ خالقِ زمین و آسمان میں بسر کرتے ہیں۔ حق جل و علیٰ زبدۂ اہالی روزگار کو تا دیر سلامت رکھے کہ اپنے خاندانِ عالی شان کے یادگار ہیں۔ آمین یا رب العالمین۔"

ملفوظاتِ عزیزی کے ایک ملفوظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ یعقوب صاحب روزانہ

ایک سی پارہ مدرسہ میں اور پھر وہی پارہ گھر میں پڑھا کرتے تھے۔ اس طرح ایک ماہ میں دو قرآن مجید بیک وقت ختم کرتے تھے۔

میاں یعقوب فرزند من.... در ہر شب یک پارہ در مدرسہ خواندہ باز در خانہ مع جماعت ہموں پارہ می خواند تا کہ دو قرآن شریف معاً پس و پیش یک دو روز ختم می کند[1]

میرے بیٹے میاں یعقوب روزانہ رات کو ایک سی پارہ باہر مدرسہ میں پڑھتے تھے اور پھر گھر میں بھی جماعت کے ساتھ وہی پارہ پڑھتے ہیں اس طرح دو قرآن مجید ایک دو روز کے آگے پیچھے ایک ماہ میں ختم کرتے ہیں۔

شاہ صاحب کی عائلی زندگی کی تفصیلات دست یاب نہیں ہوئیں صرف یہ معلوم ہوا ہے کہ وصال کے وقت آپ کی دختر، اُن کے شوہر مولانا امیر بیگ اور نواسے مولوی خلیل الرحمٰن موجود تھے[1]۔ ارواحِ ثلثہ میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے بیان کردہ ایک واقعہ میں "مولوی محمد یعقوب کے داماد مرزا امیر بیگ" کا ذکر آیا ہے۔ اس پر مولانا اشرف علی تھانوی نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ میں نے بھی والدِ مرحوم کے ہمراہ مکہ معظمہ میں ان کی زیارت کی تھی[2] مولوی خلیل الرحمٰن کی بہنیں بھی ممکن ہے ہوں۔ پھر اُن کے اخلاف بھی ہوں گے وہ کس حال اور کس رنگ میں ہیں؟ ان میں رحیمی، ولی اللٰہی اور عزیزی دل و دماغ اور سیرت و کردار سے کتنا حصّہ ارزانی ہوا ہے؟ مکہ معظمہ میں مقیم متوسلین خانوادۂ رحیمی اس کا سراغ لگا سکتے ہیں۔

شاہ یعقوب کے وصال کی تفصیلات مقالاتِ طریقت[3] میں اس طرح بیان کی گئی ہیں۔ سکندر شاہ صاحب کہتے ہیں کہ میں حضرت کی تجہیز و تکفین میں حاضر تھا یہاں تک اپنے ہاتھوں سے میں نے اور امیر بیگ صاحب اور عبد الرحیم نگینہ ساز اور نصرت خاں حضرت کے خادمِ خاص نے قبر میں اُتارا ہے۔ جمعہ کے دن بھی نمازِ صبح آپ نے تیمم سے ادا

---

[1] مقالاتِ طریقت ص۲۴۲۔ [2] ارواحِ ثلثہ ص۲۳۳۔

حافظ سورتی مہتمم مساجد بھوپال نے آپ کی تاریخ وصال اس آیۂ کریمہ سے نکالی ہے۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ [3] مقالاتِ طریقت ص۲۴۲۔

کی اور اشراق و چاشت بھی پڑھی۔ دو پہر ڈھلے جب حرم محترم میں اذان ہوئی اسی وقت رُوحِ پر فتوح نے جانب ملاءِ اعلیٰ پرواز کی۔ عصر کی نماز کے بعد جنت المادیٰ میں حسبِ وصیت آپ کے بی بی کے قبر میں قریب مزار پُرانوار مولانا اسحاق صاحب قدس سرہٗ کے دفن کیا گیا۔ جنازہ کے نماز کی ایسی کثرت ہوئی کہ تمام حرم کی دوکانیں بند ہوگئیں۔ کھڑے رہنے کی بھی بدشواری جگہ ملتی تھی۔ حرم شریف سے جنت المادیٰ تک اتنی خلقت تھی کہ قدم اٹھانا مشکل تھا۔ جنازے کو ہاتھ نہیں پہنچتا تھا۔ ہزارہا عرب بوسے لے رہے تھے۔ جس قدر امانتیں تھیں سب لکھوا دیں اور فرمایا کہ ۳۰ ریال نقرئی میرے تکیہ کے تلے ہیں اس سے تجہیز و تکفین ہووے۔ کچھ دھوم دھام اور تکلف ضرور نہیں۔

صاحبزادہ، صاحبزادیاں اور داماد

شاہ اسحاق کے ایک صاحبزادہ اور تین صاحبزادیاں تھیں۔

سلیمان صاحبزادے کا نام سلیمان تھا اور اس لئے کنیت آپ کی ابو سلیمان تھی۔ ارواحِ ثلثہ[1] کی ایک روایت ہے کہ ایک بار شاہ عبدالعزیز ٹہل رہے تھے۔ ایک خادم کی گود میں میاں سلیمان تھے۔ کچھ خواتین جھولا جھول رہی تھیں۔ انہوں نے خواہش کی کہ بچہ کو ہم گود میں لے کر جھولا جھلائیں گے مگر میاں سلیمان ان کی گود میں نہیں گئے۔ اس پر شاہ محدث نے خوش ہو کر فرمایا۔ آخر میاں اسحاق کا فرزند ہے۔

امتہ الغفور ایک صاحبہ کا نام امتہ الغفور تھا۔ صالحہ قانتہ تھیں۔ فقہ و حدیث میں یدِ طولیٰ رکھتی تھیں۔ ان کا عقد مولوی عبدالحی بڈھانوی کے صاحبزادے عبدالقیوم سے ہوا تھا۔

امیر شاہ خاں کا بیان[2] ہے کہ مولوی عبدالقیوم صاحب فرماتے تھے کہ نواب قطب الدین صاحب دف کو بھی ناجائز کہتے تھے۔ ایک مرتبہ میری اُن کی اس بارے میں گفتگو ہوئی اور ہمارے دروازہ میں ہوئی۔ میرے گھر میں (محترمہ امتہ الغفور کو) جب یہ معلوم ہوا کہ دف کے جواز و عدم جواز میں گفتگو ہو رہی ہے تو انہوں نے مجھ سے گھر میں بُلا کر کہا کہ نواب صاحب کو گھر میں بُلا لو میں پردے میں ہوئی جاتی ہوں۔ میں اُن سے اس بارے میں گفتگو کروں گی۔ وہ

---

[1] ارواحِ ثلثہ ص۱۳۳۔ [2] حکایات الاولیا (طبع کراچی) ص۲۴۳۔

پردے میں ہوگئیں اور میں نے ان کو گھر میں بُلا لیا۔ جب وہ گھر میں آئے تو میں نے گھر میں سے کہا کہ نواب صاحب آپ کو یاد ہوگا کہ جب میں بچی تھی تو ایک روز آپ مجھے گود میں لئے ہوئے تھے اور میرے ہاتھ میں ایک دھپڑی تھی (جو بچے گھڑے وغیرہ کے گھیرے پر جھلی منڈھ کر بنا لیتے ہیں) اس وقت ابّا جان (شاہ اسحاق صاحب) بیمار تھے اور زمین پر ایک گدیلے پر لیٹے ہوئے تھے۔ آپ نے مجھے ابّا کے پاس لے جا کر بٹھا دیا اور میں وہاں بیٹھ کر دھپڑی بجانے لگی۔ سو کبھی تو میں اسے زمین پر رکھ کر بجاتی تھی اور کبھی ہاتھ میں لے کر۔ جب زمین پر رکھ کر بجاتی تھی تو ابّا اس کو اٹھا کر میرے ہاتھ میں دیدیتے اور زمین پر رکھ کر نہ بجانے دیتے۔ آیا یہ واقعہ ٹھیک ہے۔ نواب صاحب نے اس کی تصدیق کی تب میں نے گھر میں سے کہا کہ اس سے ثابت ہے کہ آپ کے اُستاد ڈھول کو ناجائز کہتے تھے اور دف کو جائز۔ کیوں کہ جب اس کو زمین پر رکھ دیتی تھی تو وہ دونوں طرف سے بند ہو کر ڈھول کی طرح ہو جاتی تھی اور جب میں اُٹھا لیتی تو وہ ایک طرف سے کھُل کر دف ہو جاتی تھی۔ نواب صاحب ان کے استدلال کو سُن کر خاموش ہو گئے اور کچھ جواب نہ دیا۔

مولوی عبدالقیوم

مولوی عبدالقیوم، مولوی عبدالحی بڈھانوی کے فرزند تھے۔ مولوی عبدالحیؒ شاہ عبدالعزیزؒ کے نسبتی بھائی (مولوی ہبۃ اللہ بن نور اللہ بڈھانوی) کے فرزند تھے اور اس طرح مولوی عبدالقیوم، شاہ اسحاق کے ماموں کے بیٹے بھائی بھی ہوئے۔ ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ مولوی عبدالحی نے غلام نقی نام رکھا مگر شاہ عبدالعزیز نے عبدالقیوم تجویز کیا۔ اور وہی رائج ہوا۔ صرف و نحو اور ابتدائی کتابیں مولوی نصیر الدین شافعی سے جلالین، ابن ماجہ، نسائی اور علم الفرائض شاہ محمد یعقوب دہلوی سے اکثر صحاح ستہ مولوی سید محبوب علی سے کچھ ہدایہ مفتی محمد مراد سے باقی فقہ، بخاری شریف، کچھ بیضاوی، معالم التنزیل، مدارک، درمنثور، صحاح ستہ، قول جمیل، حزب البحر، حصن حصین، مستدرک حاکم، دارقطنی، دارمی وغیرہ سب کچھ مولانا شاہ محمد اسحاق سے پڑھا۔ [1]

---

[1] نزہۃ الخواطر الجزء السابع صـ ۲۹۷ و مقالات طریقت صـ ۲۴۳۔

۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۷ء میں مولوی عبدالحی صاحب جب سید صاحب کے پاس سرحد گئے تو ان کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ اس وقت یہ بارہ تیرہ سال کے تھے۔ ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۸ء میں جب مولوی عبدالحی کا وصال ہوا تو سید صاحب نے اُن کو ہندوستان بھیج دیا تاکہ ان کی والدہ کا غم غلط ہو۔[1]

نورالدین قادیانی

حکیم نورالدین (جو پہلے صحیح العقیدہ تھا پھر محمدی (اہلِ حدیث) پھر احمدی (قادیانی) ہوا) نے بھی صحیح بخاری اور ہدایہ مولوی عبدالقیوم سے پڑھی تھی۔ حکیم نورالدین[2] کا بیان ہے کہ بھوپال سے رخصت ہوتے وقت میں نے مولوی صاحب سے خواہش کی کہ مجھے کوئی ایسی نصیحت فرمائیں جس سے ہمیشہ خوش رہوں۔ اس پر مولوی صاحب نے فرمایا "خدا نہ بننا اور رسول نہ بننا"۔ حکیم کے استفسار پر مولوی صاحب نے فرمایا خدا تم کس کو کہتے ہو۔ حکیم نے عرض کی خدائی ایک صفت فعال لما یرید بھی ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا۔ بس یہی ہمارا مطلب ہے۔ یعنی تمہاری خواہش ہوا ور پوری نہ ہو تو نفس سے کہو تم کوئی خدا ہو۔ رسول کو اللہ کی طرف سے حکم آتا ہے وہ یقین کرتا ہے کہ اس کی نافرمانی سے لوگ جہنم میں جائیں گے اس لئے اس (رسول) کو بہت رنج ہوتا ہے۔ تمہارے فتوے کو اگر کوئی نہ مانے تو وہ یقینی جہنمی تھوڑا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا تم کو بھی اس کا رنج نہ ہونا چاہیے۔

مولوی عبدالقیوم سید احمد شہید کے ایک مرید شیخ محمد عظیم سے بیعت تھے اور ان ہی کے ساتھ کچھ دن کے لئے ٹونک بھی گئے تھے۔ پھر جب شاہ صاحب (شاہ محمد اسحاق) مکہ معظمہ ہجرت فرمانے لگے تو ان کے ساتھ چلے گئے۔ وہاں سے سکندر جہاں بیگم والیہ بھوپال نے بھوپال[3] بلا لیا اور مفتی بنا دیا۔ جاگیر بھی پیش کی۔ ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء میں بڑھانہ میں وصال ہوا۔[4]

ملا عبدالقیوم کے ایک شاگرد اور خالہ زاد بھائی قاضی محمد ایوب پھلتی (قاضی بھوپال) میرے جدِ بزرگ مولانا حکیم سید برکات احمد کے خالو بھی تھے اور شیخ حدیث بھی۔ اس طرح میرا سلسلۂ حدیث بھی ملا عبدالقیوم سے ملتا ہے۔ قاضی محمد ایوب کو ملا عبدالقیوم ہی نے پھلت

---

[1] جماعتِ مجاہدین ص۱۱۵۔ [2] مرقاۃ الیقین فی حیٰوۃ نورالدین از اکبر شاہ نجیب آبادی صفحہ ۸۲ تا ۸۹ طبع لاہور
[3] بھوپال میں جس مکان میں ملا عبدالقیوم کا قیام تھا وہ اب تک قیوم منزل کے نام سے باقی ہے۔
[4] نزہۃ الخواطر الجزء السابع ص۲۹۷ [5] مقالاتِ طریقت ص۲۴۳۔

سے بلا کر اپنا جانشین بنایا تھا۔

عبدالرحیم ضیا کا بیان ہے کہ[1] ملا عبدالقیوم کے ایک دختر اور دو صاحبزادے تھے۔ (۱) مولوی حافظ محمد ابراہیم (۲) اور حافظ محمد یوسف۔ دونوں متقی، پرہیزگار، ذی حلم و وقار اپنے خاندان کے یادگار ہیں۔ مولوی ذوالفقار احمد بھوپالی نے الروض المسطور[2] میں لکھا ہے کہ مولوی محمد یوسف مثل اپنے والد ماجد مرحوم کے درسِ حدیث میں مشغول رہتے ہیں۔ نہایت صالح و متدین ہیں۔ مولوی عبدالواسع امیٹھوی فقہ و حدیث میں مولوی حافظ محمد یوسف کے شاگرد تھے۔

مولوی محمد ابراہیم کے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا حافظ محمد اسماعیل تھے۔ ایک لڑکی ام حبیبہ زوجہ سید عباس علی تھیں جن کے لڑکے جعفر علی صاحب لاہور میں ہیں (مدیر "مشرق") دوسری لڑکی ام سلمیٰ تھیں جن کا عقد مفتی محمد شعیب بن قاضی محمد یحییٰ بن قاضی محمد ایوب پھلتی سے ہوا تھا۔ ان سے صرف مولوی محمد زبیر صاحب صدیقی یادگار ہیں[3]۔ بھوپال میں مقیم ہیں۔ حافظ محمد اسماعیل کے صاحبزادے حاجی حافظ محمد احمد (عمر ۶۵ سال) ہیں[4]۔

دختر دوم شاہ اسحاق کی دوسری صاحبزادی کا عقد شاہ محتشم اللہ سے ہوا تھا۔ شاہ محتشم اللہ شاہ معظم اللہ بن مقرب اللہ بن شاہ اہل اللہ پھلتی علیہ الرحمہ کے فرزند تھے۔ ان صاحب کے صرف ایک صاحبزادہ مولوی عبدالرحمٰن کا نام معلوم ہو سکا ہے۔ مکہ معظمہ میں مقیم تھے۔ معلوم ہوتا ہے ان کے والدین بھی شاہ اسحاق کے ساتھ حجاز منتقل ہو گئے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے المسوّیٰ کا نسخہ بھی انہی مولوی عبدالرحمٰن کے ورثا سے حاصل کیا تھا مولانا سندھی نے المسوّیٰ کے آغاز میں ایک سند بھی نقل کی ہے جو شاہ ولی اللہ نے شیخ جاراللہ بن عبدالرحیم کو دی تھی۔ یہ سند بھی مولانا سندھی کو ورثاء مولوی عبدالرحمٰن سے ملی تھی۔

معلوم نہیں اس خاندان میں آجکل بھی کوئی عالمِ دین اور صاحبِ دل ہے یا نہیں؟

دختر سوم شاہ اسحاق کی تیسری صاحب زادی مولوی سید نصیر الدین صاحب کو بیاہی تھیں۔

---

[1] مولانا نسیم احمد فریدی الرحیم حیدرآباد سندھ جون ۱۹۶۷ء۔ [2] نزہۃ الخواطر الجزء الثامن طبع دکن ۱۹۷۰ء ص ۲۱۵
[3] مولوی محمد زبیر صدیقی ۱۹۷۸ء میں وصال فرماگئے۔ [4] دسمبر ۱۹۷۸ء میں رحلت فرماگئے۔

مولوی سیّد نصیر الدین

مولوی سید نصیر الدین شاہ رفیع الدین کے نواسے اور امۃ اللہ بی زوجہ مولوی نجم الدین سونی پتی کے فرزند تھے۔ جوان ہو گئے تھے مگر علم سے محروم تھے۔ چنانچہ ان کی والدہ نے شاہ اسحاق کی صاحبزادی کے لئے اُن کا پیغام دیا تو شاہ اسحاق نے انکار کر دیا۔ اس پر انہیں حصولِ علم کا شوق پیدا ہوا اور بہت ہی قلیل مدت میں حصولِ علم کی منازل طے کر لیں۔ علوم کی تکمیل شاہ اسحاق سے کی اور فیضِ باطن شاہ محمد آفاق دہلوی سے حاصل کیا اور ایک عرصہ ان کے ساتھ رہے۔ تحریکِ جہاد کے ابتدا ہی سے سرگرم معاون رہے۔ شاہ اسحاق جب مدرسۂ رحیمیہ میں وعظ فرماتے ہوتے تھے تو یہ مدرسہ کے دروازہ پر مجاہدین کے لئے زرِ اعانت وصول کیا کرتے تھے۔ حادثۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) کے بعد جب ہنگامۂ جہاد سرد پڑنے لگا تو انہوں نے بذاتِ خود میدانِ جہاد میں جاکر عملاً حصہ لینے اور معرکۂ جہاد پھر سے تازہ کرنے کا پروگرام بنایا اور بالآخر ایک قافلے کر سنہ ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۵ء میں نکل کھڑے ہوئے اور ٹونک، اجمیر، جودھ پور ہوتے ہوئے سندھ پہنچے جہاں سیّد صاحب کے اہل و عیال پہلے سے موجود تھے۔ ادھر سرحد سے امیر جماعت ولی محمد پھلتی بھی سیّد صاحب کی تیسری (کاشغری) اہلیہ کو لے کر سندھ آچکے تھے۔ یہاں مولوی صاحب نے سندھ کے مختلف علماء، مشائخ، اُمراء وغیرہ کو ترغیبِ جہاد دی اور مشورے کئے۔ بالآخر مزاری بلوچوں کے علاقہ میں مستقل قیام اختیار کیا اور مزاری بلوچوں سے معاہدہ کر کے سکھوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ سکھوں نے مزاریوں کا ایک علاقہ روجھان[1] قبضہ میں لے لیا تھا۔ مولوی صاحب نے حملہ کر کے ۱۸۳۷ء میں روجھان مزاریوں کو واپس دلا دیا مگر بعد میں مزاریوں نے سکھوں سے صلح کر لی۔

مولوی صاحب نے سکھوں کی ایک اور جنگ "کن" کے مقام پر ہوئی مگر والئی بھاولپور اور سندھ کے حکام کے مفادات مولوی صاحب کی سرگرمیوں سے متاثر ہو رہے تھے اس لئے مولوی صاحب نے مجبوراً مہرو (بلوچستان) میں قیام کر لیا۔ مہرو کے بعد

---

[1] روجھان علاقۂ نصیر آباد متصل جیکب آباد، مسکن قوم جمالی بلوچ از سرحد سندھ ہشت میل فاصلہ دارد۔ تاریخ بلوچستان ص ۳۵ سندھ گزیٹیر ص ۱۴۳

بلوچستان کے دوسرے مقامات پر بھی تبدیل سکونت کرتے رہے۔

اسی عرصہ میں مولوی صاحب کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا رُخ سکھوں کے بجائے انگریزوں کی طرف ہوگیا جس کی صورت یہ ہوئی۔ ۱۲۵۵ھ/۱۸۴۰ء میں انگریزوں سے قلعۂ قندھار فتح کرلیا تو قلعہ گرشش فتح کرنے کا حوصلہ کیا۔ گرشش کے سقوط کے بعد محمود اعظم غزنی کی طرف یہ غاصبانہ سرخ رو بڑھے وہاں امیر دوست محمد خاں کے بیٹے غلام حیدر خاں قلعۂ غزنی میں مقیم تھے۔ پہلے دن زوردار معرکہ ہوا اور قلعۂ غزنی سے ایسی گولہ باری ہوئی کہ فرنگی فوج کی ہمت پست ہوگئی۔ دوسرے دن جب پھر معرکہ گرم ہوا تو سپاہِ فرنگ نے زور لگایا اور قلعہ پر داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ قلعہ میں تین سو غازیان جلادت نشان ردم ہندوستان (مولوی صاحب اور ان کے رفقاءِ جہاد) تھے۔ انہوں نے تلواریں نکال کر مقابلہ کیا اور انگریزی فوج کو لڑتے لڑتے باہر نکال دیا اور جوش میں خود بھی باہر نکل آئے مگر غلام حیدر کے ملازموں نے غداری کی اور فرار ہوگئے۔ اب صرف مولوی صاحب کے تین سو رفقاءِ جہاد رہ گئے جو آخرکار لڑتے لڑتے شہید ہوگئے۔

جناب زبدہ ساداتِ عظام قدوہ علماءِ کرام رافع رایاتِ اسلام مولوی سید نصیر الدین صاحب کہ بعد شہادت جناب مولانا سید میاں احمد شاہ غازی در ملک سندھ آمدہ بود بسیاری از اہلِ اسلام را دعوتِ جہاد کرد وبیش دودھ خاں مری دبجار تومبکی رفتہ چند ماہ دراں جا متوقف بودہ جہت جہاد کفار سکھ بسیار سعی وتلاش نمود لیکن موثر نیفتاد وجناب موصوف ہم دریں جنگ قلعۂ غزنی با مجاہدین مومنین راسخین جرعہ نوش بادۂ شہادت گردید۔[1]

جناب زبدہ سادات وقدوہ علماء کرام علم بردار اسلام مولوی سید نصیر الدین صاحب کو مولانا سید میاں احمد شاہ غازی (سید صاحب) کے بعد سندھ آئے تھے اور بکثرت مسلمانوں کو دعوتِ جہاد دی تھی اور دودھ خاں مری اور بجار تومبکی کے پاس جاکر چند ماہ ٹھہرے تھے اور سکھوں سے جہاد پر آمادہ کرنے کی بڑی جدوجہد کی تھی مگر جن کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی وہ مولوی صاحب بھی اس جنگ غزنی میں مجاہدین مومنین راسخین کے ساتھ مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

---

[1] تازہ نوائے معارک از عطا محمد خاں مرتبہ آقا عبدالحئی حبیبی طبع کراچی ۱۹۵۹ء ص ۲۹۷

یہ حادثۂ شہادت ۲۳ جولائی ۱۸۳۹ء کو پیش آیا تھا۔ مگر غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب اِس معرکہ میں شہید نہیں ہوئے تھے بلکہ مولوی صاحب اور ان کے باقی ماندہ رفقاء مجاہدین کے قدیم مرکز استھانہ چلے گئے تھے اور وہاں ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء میں وفات پائی۔[۵۱]
مولوی صاحب کے دو فرزند تھے عبداللہ اور عبدالحکیم۔ مولوی صاحب کی شہادت کے بعد شاہ اسحاق نے حجاز ہجرت کر جانے کا عزم فرما لیا اور ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں وہ اپنے پورے گھرانے کو لے کر ہجرت فرما گئے۔ اس قافلہ میں ان کے چھوٹے بھائی شاہ محمد یعقوب کے علاوہ بڑی صاحبزادی امۃ الغفور، اُن کے شوہر ملا عبدالقیوم، دوسری صاحبزادی اور ان کے شوہر اور تیسری صاحبزادی (بیوہ مولوی نصیر الدین) اور اُن کے فرزند تھے۔

مولانا غلام رسول مہر کو دو قلمی رسالے دست یاب ہوئے تھے۔ (۱) رسالہ مؤلفہ ابواحمد علی یہ مولوی سید نصیر الدین کے حالات میں ہے۔ (۲) مکاتیب مولوی سید نصیر الدین جسے مہر صاحب نے سرگذشت مجاہدین میں اخبار مولوی سید نصیر الدین کے نام سے یاد کیا ہے۔ کاش مولوی صاحب کے اخلاف ان دونوں رسائل کو شائع کر دیں۔

مرشد العلماء حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ابتداءً مولوی سید نصیر الدین سے بیعت ہوئے تھے۔[۵۲]

شاہ اسحاق کے تلامذہ و مُریدین و خلفاء

شاہ محمد اسحاق نے تقریباً نصف صدی درس دیا اور اس انہماک کے ساتھ دیا کہ صبح کی نماز سے لے کر عشاء کی نماز تک بہت تھوڑا سا وقت آرام اور غذا کے لئے نکالتے تھے باقی تمام وقت تدریس میں صرف ہوتا تھا۔ چنانچہ طلبا کی ایک کثیر تعداد نے آپ سے استفادہ کیا۔ مؤلف حیات بعد الممات نے آپ کے تلامذہ کی حسب ذیل فہرست دی ہے۔

۱۔ مولانا شاہ محمد یعقوب	۴۔ شیخ محمد انصاری سہارنپوری مکی
۲۔ شاہ محمد عمر بن شاہ محمد اسماعیل شہید	۵۔ مولوی عبدالخالق دہلوی
۳۔ مولوی کرامت علی اسرائیلی	۶۔ مولوی صبغۃ اللہ پانی پتی

---

۵۱ سرگذشت مجاہدین۔ ۵۲ شمائم امدادیہ ص۱۱ وارشاد مرشد ص۲۔

۷۔ میاں نذیر حسین محدث دہلوی
۸۔ مولوی یار علی باروترتہی
۹۔ مولوی محمد ابراہیم نگرنہسوی
۱۰۔ شیخ محمد تھانوی
۱۱۔ شاہ عبدالغنی مجددی
۱۲۔ مولوی سید علی احمد عظیم آبادی ٹونکی
۱۳۔ نواب قطب الدین خاں دہلوی
۱۴۔ مولوی عالم علی نگینوی
۱۵۔ شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی
۱۶۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی
۱۷۔ محمد حازمی (مکہ معظمہ)
۱۸۔ مولوی سبحان بخش شکارپوری
۱۹۔ موی عبداللہ سندھی
۲۰۔ مولوی گل کابلی
۲۱۔ مولوی نور علی سسراواں
۲۲۔ حافظ محمد فاضل سورتی
۲۳۔ حافظ حاجی محمد جونپوری دہلوی
۲۴۔ مولوی بہاءالدین دکھنی
۲۵۔ مولوی قاری حافظ اکرام اللہ دہلوی
۲۶۔ مولوی نورالحسن کاندھلوی
۲۷۔ مولوی سید نصیرالدین دہلوی
۲۸۔ مولوی عبدالقیوم بھوپالی
۲۹۔ مولوی نوازش علی
۳۰۔ رستم علی خاں دہلوی
۳۱۔ مولوی احمد علی سہارنپوری
۳۲۔ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی

آثار الصنادید، نزہتہ الخواطر اور تذکرہ علماءِ ہند وغیرہ سے اس فہرست میں حسب ذیل حضرات کا اضافہ کیا گیا ہے:۔

۳۳۔ مولوی غلام محی الدین بگوی
۳۴۔ مولوی بشیرالدین قنوجی
۳۵۔ مولوی مظفر حسین کاندھلوی
۳۶۔ مولوی عبدالجلیل علی گڈھی
۳۷۔ مولوی نصیرالدین شافعی
۳۸۔ مولوی سراج الدین سہسوانی
۳۹۔ مولوی احمد اللہ انامی
۴۰۔ مولوی سید ابو محمد جالیسری
۴۱۔ مولوی خواجہ ضیاءالدین احمد دہلوی
۴۲۔ عبداللہ صدیقی
۴۳۔ ظہور احمد کالپوی

اندازہ کیجئے کہ جس عالم نے تقریباً نصف صدی روزانہ نمازِ صبح سے نمازِ عشاء تک درس دیا ہو اس کے تلامذہ کی یہ فہرست کس قدر ناقص و ناتمام ہے۔

بہر حال ہم ان میں سے چند علماء کا مختصر تذکرہ کریں گے۔ شاہ محمد یعقوب، مولوی سید نصیر الدین اور مولوی عبدالقیوم بڈھانوی کا تذکرہ "اخلاف" کے زیرِ عنوان ہو چکا ہے۔

نواب قطب الدین خاں بہادر دہلوی

ولادت ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء۔ حدیث و فقہ کی تحصیل و تکمیل شاہ محمد اسحاق سے کی۔ شیخ محمد محدث تھانوی آپ کے شریکِ درس تھے۔ ان کے بزرگ مغل دربار میں منصبِ عالی پر فائز رہے۔ آثار الصنادید کی تالیف (۱۸۴۶ء) کے عہد تک خود ان کو بھی تقربِ حضرتِ سلطانی سے وہ عزّ و جاہ حاصل ہے جو چاہیئے۔ نواب صاحب کو شاہ صاحب سے جو نسبت خاص حاصل تھی اس کا اندازہ سرسید کے ان الفاظ[1] سے ہو سکتا ہے۔

"وضع و لباس میں اپنے استادِ عالی نہاد سے ایسے مشابہ ہیں کہ جس نے ان کو نہ دیکھا ہو ان کو دیکھے۔ استاد ہی کی پیروی میں وہ ہفتہ میں دو دن مجلسِ درس بھی برپا کرتے تھے۔ شاہ صاحب کی ہجرت کے بعد دہلی میں عدم تقلید کے مبلغوں نے جو زور باندھا تھا اس کا اگر کسی حد تک مقابلہ کیا تو نواب صاحب نے۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ اس منظم تحریک کا کما حقہ مقابلہ کیا ہی نہیں گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود شاہ صاحب کی شخصیت ماضی کے غبار میں گم ہو کر رہ گئی۔ اور آج ان کی حیاتِ بابرکات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق تفصیلات اوراقِ تراجم میں محفوظ ہوں۔ بہر حال نواب صاحب ان حضرات میں سب سے نمایاں ہیں۔ جو اپنے استاد کے مسلک (حنفیت) پر مستقیم رہے اور عدم تقلید کے خلاف حتی الوسع اور مدۃ العمر رزم آرا رہے۔ ان ہی کی کتاب "تنویر الحق" کے جواب میں میاں نذیر حسین صاحب نے معیار الحق تالیف کی جو اُن کی واحد مبسوط تالیف ہے اور جس کا جواب مولوی ارشاد حسین رام پوری نے انتصار الحق کے نام سے دیا ہے۔

نواب صاحب ہر تیسرے چوتھے سال حج کو جایا کرتے تھے وہیں ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء میں وفات پائی۔ نواب صاحب کے صرف ایک صاحبزادہ تھے نصیر الدین خاں جن کے دو[2]

---

[1] آثار الصنادید ص۲۷۶

بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے ایک خان بہادر بشیر الدین احمد کی خوش دامن تھیں۔

تالیفات | مظاہر حق، جامع التفاسیر اردو، ظفر جلیل، (ترجمہ حصن حصین)، منظر جلیل، مجمع الخیر، جامع الحسنات، خلاصہ جامع الصغیر، ہادی الناظرین، خفقہ سلطان، معدی الجواہر، وظیفہ مسنونہ، تحفۃ الزوجین، احکام الضحیٰ، فلاحِ دارین، تنویر الحق، توحید الحق، تحفۃ العرب والعجم، احکام العیدین، رسالہ مناسک، خلاصۃ النصائح، گلزارِ جنت، تنبیہ النساء، حقیقۃ الایمان، مراد المعاد، تذکرۃ الصیام، تذکرۃ الریا، آداب الصالحین وغیرہ۔

مآخذ:۔ نزہۃ الخواطر الجزالسابع ص۳۸۷۔ تذکرہ علماءِ ہند ص۱۶۹۔ آثار الصنادید ص۲۷۶۔ سیاسی تحریک ص۲۵۶۔ حدائق الحنفیہ ص۴۸۸۔ واقعات دارالحکومت دہلی ص۲۲۴۔

قاری عبدالرحمٰن پانی پتی

قاری محمد انصاری کے فرزند تھے۔ حاجی سید قاسم، مولوی رشید الدین خاں، مولوی مملوک العلی اور شاہ محمد اسحاق سے علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ تجوید کا فن قاری امام علی سے حاصل کیا۔ ۱۶ سال باندہ میں درس دیا۔ بکثرت تلامذہ فیض یاب ہوئے۔ وفات نوّے برس کی عمر میں ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء میں ہوئی۔[1] قاری صاحب شاہ صاحب کے سعید و رشید تلامذہ میں سے تھے۔ اپنے بعض معاصرین کے برعکس اپنی حنفیت پر قانع اور نازاں تھے۔ "تمسک بالکتاب والسنہ" کے نام پر عدم تقلید کے مبلغین کے "اداشناس" تھے۔ غدر کے بعد جب اس گروہ نے اہلِ حدیث کے نام سے اپنی تنظیم کی اور اپنی افتراق انگیز سرگرمیوں کا آغاز کیا تو قاری صاحب ان کے لئے دردِ سر بن گئے۔ آگے چل کر جب میاں نذیر حسین صاحب نے شاہ صاحب کی خلافت کا ادّعا کیا تو اس وقت بھی ان کی تردید کے لئے قاری صاحب ہی سامنے آئے کیونکہ اس حلقہ اور اس دَور کے علماء میں یہی حیات تھے۔ میاں صاحب انہیں اپنا رفیقِ درس بتاتے تھے مگر قاری صاحب نے میاں صاحب کے شاہ صاحب کے تلمذ ہی کو تسلیم نہیں کیا۔ "کشف الحجاب" مکائدِ اہلِ حدیث میں

---

[1] مولانا الطاف حسین حالی۔ تذکرۂ رحمانی (کشف الحجاب ۱۹۸۱ء کراچی۔

ایک مدلل اور دل چسپ رسالہ ہے۔

مولانا احمد علی سہارن پوری

دہلی میں پہلے مولانا مملوک علی اور پھر شاہ محمد اسحاق سے تحصیل و تکمیل کی۔ پہلے چند سال دہلی میں درس دیا پھر ایک مطبع (احمدی) قائم کیا اور کتب حدیث کی اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ سننِ ترمذی، صحیح بخاری وغیرہ تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کیں۔ اس کام میں اُن کے چند شاگرد اور مولانا محمد قاسم نانوتوی شریک رہے۔ شاگردوں میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن وغیرہ مشاہیر علماء ہیں۔ وفات ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء۔

ماخذ حیات بعد الممات صفحہ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۸۴۔ ۹۳۔ ۵۲۴، سیاسی تحریک ص۲۶۵، نزہۃ الخواطر ص۴۳

مولوی عبد اللطیف ثالث محی الدین قطب ویلوری

بن مولوی ابی الحسن دہلوی، مدراسی، ولادت ۱۲۰۷ھ مقامی علماء سے تحصیل کی اور ۱۲۴۲ھ میں فارغ ہوئے۔ ۱۲۶۰ھ میں حج کا فریضہ ادا کیا۔ وہاں شاہ محمد اسحاق سے سندِ حدیث لی۔ ۱۲۶۲ھ میں کبرسن میں انگریزی زبان میں نوشت و خواند کی قدرت حاصل کی اور ملکۂ انگلستان (وکٹوریہ) کو انگریزی میں خط لکھ کر اسلام کا پیغام پہنچایا۔ وفات ۱۲۸۹ھ۔

مولوی محی الدین کو سفرِ حجاز پر شاہ صاحب نے جو سند عطا فرمائی تھی وہ نقل کی جاتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین و علی آلہ واصحابہ اجمعین۔ اما بعد فیقول العبد الضعیف الحقیر خادم العلماء علی الاطلاق محمد اسحاق ان ابا الفتح الجلیل صاحب فضل المبین الشیخ محی الدین سلمہ اللہ الی یوم الدین طلب منی الاجازۃ لبعض کتب الحدیث فاجزت لہ اجازۃ الکتب الصحاح الستۃ۔ البخاری ومسلم وسنن ابی داؤد والجامع للترمذی وسنن النسائی وابن ماجۃ للقزوینی وایضا اجزت لہ مشکوٰۃ المصابیح والحصن الحصین للجزری وحصل لی الاجازۃ والقراۃ

لهذه الكتب من الشيخ الذى فاق بين اقرانه باليقين اعنى الشيخ عبد العزيز رحمه الله تعالىٰ وحصل له الأجازة عن والده الشيخ ولى الله المحدث الدهلوى العارف بالله و حصل له الأجازة عن الشيخ ابى طاهر المدنى وحصل له الاجازة عن والده الشيخ ابراهيم المدنى وانها فى سنده مذكور فى محله

خرره فى مكة المعظمة فى شهر جمادى الاولى من سنة ۱۲۶۲ من الهجرة على صاحبها الف الف صلوٰة و تحية۔

محمد اسحاق سنہ ۱۲۵۸ھ

مہر

؎ مقالاتِ طریقت صفحہ ۲۵۶، ۲۵۷

منشی جمال الدین بن شیخ وحید الدین

کوتانہ ضلع میرٹھ وطن ہے۔ نسباً صدیقی ہیں۔ مولانا مملوک علی، شاہ محمد یعقوب دہلوی سے تحصیلِ علوم کی۔ ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۶ء بھوپال میں معمولی ملازمت کی اور ترقی کرتے کرتے وہاں کے وزیر اعظم بن گئے۔ نواب صدیق حسن خاں کی پہلی اہلیہ ان ہی کی صاحبزادی تھیں۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے سے جو عقیدت تھی اس کی بنا پر شاہ ولی اللہ اور شاہ اسماعیل شہید کے کئی رسائل انہوں نے طبع کرائے۔ قرآن مجید کا پشتو ترجمہ بھی شائع کیا۔ سید احمد شہید کے حالات میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا جو سید جعفر علی نقوی صاحبِ منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء کے پیشِ نظر رہا تھا۔

مگر پھر کبھی اس کا نام سننے میں نہیں آیا۔ قرآن مجید کا ایک فرہنگ کوکب دری بھی لکھا تھا۔ شاعر بھی تھے۔ گمنام تخلص تھا۔

منشی جمال الدین نے محمد بن ناصر جعفری سے بھی مکہ معظمہ میں پڑھا تھا۔

ماخذ۔ مرقات الیقین فی حیات نور الامین لاہور۔ سنہ ندارد از اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی صفحہ ۸۲، ۸۶، ۸۸ مولانا محمد احسن نانوتوی۔ از پروفیسر محمد ایوب قادری۔

مولانا عبدالخالق دہلوی

ابن خیر اللہ علماء دہلی خصوصاً شاہ محمد اسحاق سے تحصیلِ علوم کی۔ پنجابی کٹرہ میں قیام تھا اس محلہ کی اورنگ آبادی مسجد میں درس دیتے تھے۔ میاں نذیر حسین بہار سے آکر اولاً اسی مسجد میں مقیم ہوئے تھے اور مولوی عبدالخالق ہی کا تلمّذ اختیار کیا تھا۔ انہی کی لڑکی سے میاں صاحب کی شادی ہوئی تھی۔ مسلکاً حنفی تھے اور آخر تک اسی مسلک پر وہ اور ان کے اخلاف رہے۔ جب میاں صاحب نے عدم تقلید کی تحریک شروع کی تو مولوی عبدالخالق کے صاحبزادے نے ان کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔ وفات ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں ہوئی۔

مولوی عبدالخالق کے دو لڑکے تھے۔ ایک مولوی عبدالرب جو دہلی کے مشہور واعظ تھے۔ دوسرے مولوی عبدالقادر جو دہلی کے محلاتِ شاہی میں امام تھے۔ انہی کی لڑکی سے ڈپٹی نذیر احمد کا عقد ہوا تھا۔ مولوی عبدالخالق کے والد کا نام خیر اللہ تھا، اسی لئے ان کے اخلاف خود کو خیری لکھتے ہیں۔ مشہور مصلح نسواں راشد الخیری اور مشہور سیاسی مفکر خیری برادران (ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور پروفیسر عبدالستار خیری) ان ہی میں سے تھے۔

ماخذ۔ آثار الصنادید، حیات بعد الممات، واقعات دار الحکومت حصہ دوم ص ۱۴۲

مولانا عالم علی مراد آبادی

والد کا نام کفایت علی تھا۔ مولوی مملوک علی، مولوی نوازش علی، حکیم محمد شریف خاں اور شاہ محمد اسحاق سے علومِ عقلیہ و دینیہ حاصل کئے۔

تصانیف۔ رسالہ فضائلِ صیام، رسالہ فضائل رسولِ مقبول، رسالہ قراءتِ ضاد معجمہ، رسالہ تعدد جمعہ، شرح ضابطہ، شرح تہذیب یزدی۔

تلامذہ۔ مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا دائم علی عظیم آبادی ٹونکی (والد مولانا سید برکات احمد)

وفات۔ ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء بعمر ۷۶ سال۔

ماخذ۔ تذکرہ علمائے ہند، نزہتہ الخواطر الجزء السابع صفحہ ۲۲۹۔ آپ خلیفۂ طریقت بھی ہیں۔

مقالاتِ طریقت صفحہ ۲۴۰

مفتی صدر الدین آزردہ

خاصانِ دہلیٔ مرحوم میں سے تھے۔ مرجع خواص اور مجلسی شخصیت تھے۔ ایک جامع کمالات بزرگ جو بہ یک وقت علومِ دینیہ، علومِ عقلیہ، شعر و ادب میں بلند پایہ تھے، کشمیر کے ایک علمی و دینی گھرانے کے فرد تھے۔ دادا بقول شاہ عبدالعزیزؒ شاہ ولی اللہ کے اصحاب میں سے تھے۔ والد مولوی لطف اللہ کشمیری بھی عالم تھے۔ مفتی صاحب کی ولادت ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ء میں دہلی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ پھر شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ محمد اسحاق، مولانا فضل امام خیرآبادی سے دینیات، معقولات کی تحصیل و تکمیل کی، خطاطی میں سراج الدین ظفر میر کے شاگرد تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی جو ان سے آٹھ سال چھوٹے تھے اُن کے رفیقِ درس تھے۔ یہ رفاقت و خلت مدت العمر رہی۔ مولانا جب الور میں مقیم تھے تو مفتی صاحب نے ایک قصیدہ میں فرمایا تھا۔

رشکِ تہران و بخارا شدہ دلی از من   الور از ذاتِ ہمایونِ تو یوناں باشد

مفتی صاحب کے تلامذہ میں سرسید احمد خاں، نواب صدیق حسن خاں، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا نور الحسن کاندھلوی وغیرہ بکثرت اکابر علماء ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مفتی صاحب نے کمپنی کی ملازمت اختیار کرلی۔ پہلے کئی سال صدر امین رہے، پھر صدر الصدور ہوگئے اور ہنگامۂ سن ستاون تک اسی عہدہ پر فائز اور نیک نام رہے۔ سن ستاون میں علمائے دہلی نے برطانوی غاصبوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا اس پر مفتی صاحب نے بھی دستخط کئے تھے جس کی پاداش میں وہ گرفتار کرلئے گئے اور جائداد منقولہ جس میں وسیع حویلی وغیرہ کے ساتھ اُن کا ذخیرہ نوادر کتب خانہ بھی تھا، ضبط کرلئے گئے، کئی سال کی تگ و دو کے بعد سکونت کے لئے حویلی کا ایک حصہ واپس کیا گیا۔

فالج میں مبتلا ہوکر ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ میں وفات پائی۔ مفتی صاحب شاعر بھی تھے اور شاعر نواز بھی۔ مومن، غالب وغیرہ شعرائے عصر سے مراسم تھے۔ عربی، فارسی اور اردو

میں شعر کہتے تھے۔

تصنیف اور تالیف کی طرف توجہ کم رہی پھر بھی متعدد تالیفات آپ کے قلم سے نکلیں جن میں سے کئی سن ستاون کے ہنگامہ کے بعد ناپید ہو گئیں۔ (۱) حاشیہ قاضی مبارک (۲) کتاب صنائع و بدائع (۳) شرح دیوان متنبی (۴) دار المقصود فی حکم امراۃ المفقود یہ چار تالیفات اب نایاب ہیں۔

(۵) حاشیۂ میر زاہد، یہ کتاب مولانا نورالحسن کاندھلوی کی مکتوبہ ان کے خاندان میں موجود ہے۔ (۶) رسالہ در مسئلہ امتناع النظیر (فارسی)۔ یہ ۱۲۹۰ھ میں ایک مجموعہ میں مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ برکات اکاڈمی کے کتب خانہ میں اس کا ایک مخطوطہ ہے جو تالیف کے فوراً بعد کا مکتوبہ ہے۔ (۷) منتہی المقال فی شرح حدیث لا تشد الرحال، ابن تیمیہ اور وہابیانِ ہند کے رد میں ایک فاضلانہ تحریر ہے جو مطبع علویہ دہلی ۱۲۶۴ھ میں طبع ہوا تھا پھر شرف المطابع دہلی سے ۱۲۶۸ھ میں دوبارہ شائع ہوا۔ اس پر مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی سعد اللہ مرادآبادی کی تقاریظ ہیں۔ ثانی الذکر کی طباعت ہمارے کتب خانہ میں ہے۔ (۸) تذکرہ شعراء اردو۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے دریافت کیا اور مدوّن و شائع کیا۔ یہ ناقص الآخر ہے۔ یہ ۱۲۳۳ھ سے قبل کی تالیف ہے مگر تعجب ہے اس میں مومن، ذوق اور غالب نہیں ہیں اور کئی ایسے شعر جو مفتی صاحب کے معاصرین نے ان کے نام سے لکھے ہیں وہ اس تذکرہ میں دوستوں کی طرف سے منسوب کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی وجوہ سے ہمیں اس تذکرہ کے مفتی صاحب کی طرف انتساب میں کلام ہے۔ آثار الصنادید، حدائق الحنفیہ، الیانع الجنی، نزہۃ الخواطر، حیات بعد الممات

مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی

ولادت ۱۲۰۸ھ وفات ۱۳۱۳ھ۔ تلمذ شاہ عبدالعزیز، مرزا حسن علی کبیر محدث لکھنوی، شاہ محمد اسحاق وغیرہ اور بیعت شاہ محمد آفاق دہلوی و شاہ غلام علی دہلوی سے۔

اپنے دور کے عظیم المرتبت شیخ طریقت تھے۔ صدہا علماء نے آپ سے فیض پایا۔

ماخذ۔ تذکرہ علماء ہند ص۱۶۴، تذکرہ فضل رحمان از ابوالحسن علی ندوی، حیات بعد الممات ص۱۴۲

مولوی نوازش علی اصل میں پونڈل (کرنال) کے رہنے والے تھے۔ شاہ محمد اسحاق سے حدیث پڑھی اور دہلی میں رہ گئے۔ درس دیتے تھے۔ وعظ کی شہرت تھی۔ سرسید نے بھی ان سے پڑھا تھا۔ حیاتِ جاوید، آثارالصنادید، النزہہ سابع ص۵۰۹

مولوی عبدالجلیل علی گڑھی مولوی ریاض الدین اسرائیلی کے صاحبزادے۔ ولادت ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء، مولانا بزرگ علی مارہروی اور شاہ محمد اسحاق سے تلمذ تھا۔ بدایوں اور چھتاری میں درس دیا۔ سید احمد شہید سے بیعت تھے۔ سن ستاون کے جہادِ آزادی میں حصہ لیا اور شہادت کی سعادت پائی۔ علی گڈھ کی جامع مسجد میں مزار ہے۔ نواب صدیق حسن خاں کے بھائی اور غالب کے شاگرد مولوی احمد حسن عرشی اور مولوی بشیرالدین قنوجی نے اُن ہی سے تحصیلِ علم کی تھی۔ نزہۃ الخواطر جزء سابع ص۲۳۸، تذکرۂ علماءِ ہند ص۱۰۴، حیاتِ وحید الزماں از مولانا عبدالحلیم چشتی ص۱۹۔

قاضی محمد جمیل برہانپوری عرفیت بسم اللہ تھی۔ ابتدائی کتابیں مقامی علماء سے پڑھیں پھر دہلی آکر مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور شاہ محمد اسحاق سے تحصیل کی۔ شاہ ابوسعید مجددی سے بیعت کی۔ ۱۲۳۹ھ میں برہانپور کے قاضی مقرر ہوئے پھر حیدرآباد کو منتقل ہو گئے اور وہاں درس دیتے رہے۔ وہیں ۱۲۷۴ھ میں وفات پائی۔ تذکرہ علماءِ ہند۔

مولوی بشیرالدین قنوّجی ولادت ۱۲۳۴ھ۔ مولوی عبدالجلیل علی گڈھی اور شاہ محمد اسحاق سے تلمذ تھا، فراغت کے بعد دہلی میں مقیم ہو گئے۔ اور وہاں درس میں مشغول رہے۔ آخر میں بھوپال میں قاضی ہو کر چلے گئے۔

مولوی سید عبدالحیؒ نے ان کو شاہ عبدالعزیز کا شاگرد لکھا ہے۔ مولانا فضل رسول بدایونی نے شاہ اسحاق کی کتاب مأۃ مسائل کے رد میں تصحیح المسائل لکھی تو مولوی بشیرالدین قنوجی نے اس کے جواب میں تفہیم المسائل لکھی تھی۔ اس کتاب کے علاوہ غایۃ الکلام فی امر المولد والقیام اور کشف المبہم شرح مسلم الثبوت بھی ان کی تصانیف ہیں۔

نزہۃ الخواطر الجزء السابع ص۱۰۰، حیات بعد الممات ص۲۲۴ و ص۵۱۲، حیات وحید الزماں ص۱۹۔

مولوی سراج احمد سہسوانی ولادت تقریباً ۱۲۳۱ھ۔ مفتی شرف الدین رام پوری، مولوی تراب علی لکھنوی، مفتی محمد اسماعیل اور شاہ محمد اسحاق سے تلمذ تھا۔ واجد علی شاہ والیٔ اودھ کے عہد میں کاکوری کے تحصیل دار تھے۔ ۱۲۷۹ھ میں وفات پائی۔ شاہ محمد اسماعیل کی تقویۃ الایمان کی حمایت میں شرح لکھی۔

نزہۃ الخواطر الجزا السابع ص ۱۹۵، حیوٰۃ العلماء ص ۴۳، ترجمہ تذکرہ علماء ہند ص ۵۷۱

مولوی مظفّر حسین کاندھلوی مولوی سید عبدالحئی نے انہیں شاہ محمد یعقوب کا شاگرد لکھا ہے مگر وہ مفتی الٰہی بخش اور شاہ محمد اسحاق کے بھی شاگرد بتائے جاتے ہیں۔ وفات ۱۲۸۳ھ۔ مدفون جنّت البقیع۔

مولوی یار علی ترہتی فنون اپنے وطن ترہت (بنگال) کے علماء سے پڑھے۔ حدیث شاہ محمد اسحاق سے حاصل کی۔ بڑے ذکی و ذہین عالم تھے۔ نزہۃ الخواطر ص ۵۳۱

مولوی غلام محی الدین بگوی ولادت ۱۲۰۲ھ۔ شاہ عبدالعزیز و شاہ محمد اسحاق سے تلمذ تھا۔ لاہور کی لال مسجد میں تیس سال مسلسل درس دیا پھر بھیرا (پنجاب) چلے گئے اور وہاں بھی ۱۴ سال درس و افادہ میں مشغول رہے۔ ۱۲۷۱ھ میں وفات پائی۔ ان کے صاحبزادے مولوی غلام محمد اور مولوی عبدالعزیز بگوی تھے۔

حدائق الحنفیہ ص ۴۷۶، تذکرہ علماء ہند۔

مولوی محمد رستم علی خاں دینی علوم شاہ محمد اسحاق سے حاصل کئے۔ طب بھی پڑھی۔ ۱۸۴۷ء میں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں نقل نگاری کی خدمت پر مامور تھے۔ شاہ کی طرف سے مصلح الدولہ حکیم محمد رستم علی خاں بہادر کا خطاب ملا تھا۔ آثار الصنادید طبع کراچی ص ۲۹۶

مولوی نور الحسن کاندھلوی ابی الحسن بن مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے بیٹے تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ، علامہ فضل حق خیر آبادی اور شاہ محمد اسحاق سے عقلیات و نقلیات کی تحصیل کی۔ نہایت عابد و زاہد بزرگ تھے۔ مولوی عبداللہ واسطی بلگرامی ان کے شاگرد تھے۔ وفات ۱۲۸۵ھ / ۹-۱۸۶۸ء میں کاندھلہ میں ہوئی۔

آثار الصنادید ص ۲۹، تذکرہ علماء ہند ص ۱۰۴، نزہۃ الخواطر ص ۵۱۱۔

شاہ عبد الغنی دہلوی

شاہ ابو سعید مجددی فاروقی کے فرزند تھے۔ ولادت ۱۲۳۵ھ میں دہلی میں ہوئی۔ تعلیم اپنے والد سے اور مولوی مخصوص اللہ صاحب و شاہ اسحاق صاحب سے حاصل کی۔ دہلی میں برسوں درس حدیث دیتے رہے۔ غدر کے بعد مدینہ منورہ منتقل ہو گئے۔ ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء میں وفات پائی۔ انجاح الحاجہ کے نام سے سنن ابن ماجہ کا ذیل لکھا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی ان کے شاگرد تھے۔ مولوی محمد محسن ترہتی نے الیانع الجنی آپ ہی کے حالات میں تالیف کی تھی۔

خزینۃ الاصفیا ص۶۹۸، نزہۃ الخواطر ص۲۸۹، حدائق الحنفیہ ص۲۹، تذکرہ علماء ہند ص۱۲۶/۲۱۰

مولوی کرامت علی اسرائیلی

خلف مولوی حیات بخش خوشنویس۔ مولانا فضل امام، شاہ رفیع الدین، شاہ اسماعیل، شاہ اسحاق، خواجہ فرید الدین سے تحصیلِ علم کی۔ مسلکاً حنبلی تھے۔ دہلی سے تلاشِ معاش میں حیدر آباد جا کر متوطن ہو گئے تھے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بسوط سیرت "سیرۃ المحمدیہ" لکھی تھی جو دکن میں طبع ہوئی۔ وفات ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں دکن میں ہوئی۔

آثار الصنادید ص۔۔، سیرتِ فریدیہ ص۔۔، حیات بعد الممات ص۔۔، واقعاتِ دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص۴۱۵، نزہۃ الخواطر ص۳۹۶۔

شیخ محمد محدث تھانوی

بن مولوی محمد احمد اللہ بن حکیم محمد بخش۔ ولادت ۱۲۱۵ھ (تھانہ بھون یو پی) ابتدائی تعلیم کے مراحل وطن ہی میں طے کر کے اعلیٰ مدارج کی تکمیل کے لئے ۱۲۴۸ھ میں دہلی پہنچے۔ وہاں مولانا فضل حق، مولانا مملوک علی اور شاہ محمد اسحاق سے علومِ عقلی و نقلی کی تحصیل و تکمیل کی اور وطن واپس پہنچ کر درس افادہ میں مصروف ہو گئے۔ ۱۲۶۳ھ میں حج کا فریضہ ادا کیا اور وہاں شاہ محمد یعقوب دہلوی سے مستفیض ہوئے اور ان کے خانوادۂ گرامی کے اشغال و اعمال کی اجازت اور تفسیر، فقہ اور حدیث کی سند حاصل کی۔ ۱۲۷۸ھ میں نواب وزیر الدولہ کی دعوت و درخواست پر ٹونک تشریف لے گئے اور ولی عہد (بعد میں نواب محمد علی خاں) کے استاد مقرر ہوئے۔ وہاں نواب محمد علی خاں کے علاوہ ان سے بہت سے حضرات مستفید ہوئے جن میں سے میرے جد سید برکات احمد

بھی تھے۔ انہوں نے محدث تھانوی کو شمائلِ ترمذی سُنائی تھی۔ کئی سال کے بعد ٹونک سے تھانہ بھون تشریف لے گئے اور ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء میں وصال فرمایا۔

تصانیف۔ (۱) حاشیہ بر سنن نسائی (۲) دفتر ہفتم مثنوی مولوی معنوی (۳) شرح حزب البحر (۴) ارشادِ محمدی (فارسی تصوّف) (۵) انوارِ محمدی (تصوف) (۶) بیاضِ محمدی۔ (۷) مناظرہ محمدی (۸) قسطاس فی اثر ابن عباس (۹) رسالۂ الہامات الموجود والودود فی تحقیق وحدۃ الوجود والشہود (۱۰) مکاتیبات محمدیہ (۱۱) تفضیل الختنین (۱۲) حاشیہ شرح عقائد (۱۳) دلائل الاذکار۔

مآخذ۔ تحقیق وحدت الوجود والشہود، مرتبہ نثار الحق ایم۔ اے علیگ کراچی ۱۹۶۳ء نزہۃ الخواطر ص ۴۱۲۔ الحیات بعد الممات ص ۳۷، ارشاد محمدی ص ۳۔

احمد اللہ نامی بن دلیل اللہ صدیقی۔ شاہ محمد اسحاق سے منسوب کتاب مأۃ مسائل کے جامع تھے۔ مولوی سخاوت علی جونپوری اور مولوی کرامت علی جونپوری نے آپ سے استفادہ کیا تھا۔

نزہۃ الخواطر الجزء السابع ص ۴۷، ص ۴۸۔

مولوی عبدالہادی جھومکوی ولادت ۱۲۰۵ھ جھومکا (چمپارن) ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے۔ حساب، تاریخ، ادب اور انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کی اور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے قوانین کا مطالعہ کر کے مقابلہ کے امتحان میں شرکت کے لئے پٹنہ گئے۔ وہاں اس وقت سید احمد شہید اپنے قافلہ کے ساتھ حج کو جاتے ہوئے گذر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اسلام و ایمان کی سعادت حاصل کی۔ اور مولوی ولایت علی صادقپوری، مولوی حسن علی قنوجی اور شاہ محمد اسحاق سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ سید صاحب نے ان کو سارن و چمپارن میں تبلیغ کے لئے متعین کیا۔ یہ دورے کر کے تبلیغ کرتے تھے اور حسبِ دستور اعدائے دین کی ایذا کا ہدف بنتے تھے۔ ۱۲۶۵ھ میں سفرِ حج کے لئے روانہ ہوئے اور اسی سفر میں رُخ بدل کر دارِ آخرت جا پہنچے۔

نزہۃ الخواطر ص ۳۱۷۔

مفتی عنایت احمد کاکوری

ولادت ۱۲۲۸ھ دیوہ رام پور میں سید محمد بریلوی مولانا حیدر علی ٹونکی اور مولوی نورالاسلام دہلوی سے پھر دہلی میں شاہ محمد اسحاق سے پھر علی گڈھ میں مولانا بزرگ علی مارہروی سے تحصیلِ علوم کی۔ برسوں علیگڑھ میں درس دیا۔ پھر کمپنی کی طرف سے مفتی و قاضی ہوگئے پھر بریلی کے صدر امین اور بعد میں آگرہ کے صدرالصدور ہوگئے۔ اسی اثنار میں غدر برپا ہوگیا اور یہ بغاوت کے جرم میں گرفتار ہوگئے۔ انڈمان بھیجے گئے۔ انڈمان کا انگریز حاکم عالمانہ ذہن و دماغ کا آدمی تھا اس نے ان سے تقویم البلدان کا انگریزی ترجمہ کرایا اور اس سلسلہ میں ان کو رہائی دلوائی۔ انڈمان سے کانپور میں آکر مقیم ہوئے اور وہاں مدرسہ فیض عام میں جو خاص انہی کے لئے جاری کیا گیا تھا درس دینا شروع کیا۔ تین سال کے بعد حج کے لئے روانہ ہوئے۔ راہ میں جہاز غرق ہوگیا۔

تالیفات۔ (۱) علم الفرائض (۲) ملخصات الحساب (۳) تصدیق المسیح (۴) الکلام المبین (۵) محاسن العمل (۶) الدر الفرید (۷) ہدایات الاضاحی (۸) ضمان الفردوس (۹) اربعین (۱۰) رسالہ لیلۃ القدر (۱۱) رسالہ فی فضل العلم والعلماء (۱۲) رسالہ فی فضل الصلوٰۃ علی النبی (۱۳) رسالہ فی ذم "میلہ" (۱۴) علم الصیغہ (۱۵) وظیفہ کریمیہ (۱۶) تاریخ حبیب اللہ (۱۷) خجستہ بہار (۱۸) ترجمۂ تقویم البلدان (۱۹) مواقع النجوم۔

وفات ۱۲۷۹ھ۔ نزہۃ الخواطر الجزء السابع ص ۳۴۱ و ۳۴۲۔

مولانا احمد الدین بگوی

بن نور حیات۔ اپنے بڑے بھائی مولانا غلام محی الدین بگوی اور شاہ محمد اسحاق سے تحصیلِ علوم کی۔ ۱۴ سال دہلی میں بسلسلۂ طلبِ علم مقیم رہے۔ پھر پنجاب چلے گئے۔ وہاں مدتوں درس دیا۔ کثیر التعبد اور کثیر الذکر بزرگ تھے۔

تالیفات۔ حاشیہ شرح جامی اور حاشیہ خیالی۔ وفات شوال ۱۲۸۶ھ۔

حدائق ص ۴۶۶۔ نزہۃ الخواطر ص ۴۶۔

مولانا ابراہیم نگرنہسوی

بن مدین اللہ بن امین اللہ نگرنہسوی۔ ولادت ۱۲۲۵ھ۔ اپنے والد، علماءِ رام پور سے تعلیم حاصل کرکے دہلی پہنچے اور مولانا صدرالدین خاں آزردہ اور شاہ محمد اسحاق سے تکمیل کی۔ سید احمد شہید سے بیعت ہوئے۔ مدرسۂ عالیہ

کلکتہ میں مدرس ہو گئے اور ۸ا سال وہاں درس دیا۔ کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔

تلامذہ :۔ مولانا الہ داد مدرس مدرسۂ عالیہ، مولوی شیخ گلزار علی نگر ہنسوی، مولوی شیخ محمد سعید مہکاروی، مولوی عبد الغنی چھپری اور مولوی نجابت اللہ اور بکثرت دوسرے علمائے استفادہ کیا۔

تصانیف: المجبی شرح دیوان متنبی، ضابطۂ الادباء، حاشیہ قطبی وغیرہ۔ نزہۃ الخواطر ص۶

مولوی عبد الرشید مجددی فاروقی

بن مولوی احمد سعید بن مولوی ابی سعید مجددی فاروقی دہلوی خانوادہ شیخ مجدد سے تھے۔ ولادت ۱۲۳۷ھ میں لکھنؤ میں ہوئی۔ شاہ اسحاق سے حدیث حاصل کی۔ ۱۲۷۴ھ میں اپنے والد کے ساتھ حرمین کا سفر کیا۔ پہلے مدینہ منورہ اور پھر مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کی۔ وفات ۱۲۸۷ھ۔ نزہۃ الخواطر ص۲۶۱

مولوی عبد العزیز دہلوی

بن الٰہی بخش بن محمد جمیل دہلوی۔ ولادت ۱۲۱۱ھ میں۔ مولوی کریم اللہ دہلوی، شاہ عبد العزیز، شاہ محمد اسحاق، مولوی محرم علی چشتی اور مسکین شاہ سے تحصیلِ علوم کی۔ شاہ محمد غوث مارہروی سے بیعت تھے۔ حلیم، متواضع اور صوفی مستقیم الحال تھے۔

وفات ۱۲۹۶ھ میں ہوئی۔ مزار حضرت خواجہ باقی باللہ کی درگاہ میں ہے۔ نزہۃ الخواطر ص۲۱۸

مولوی خواجہ احمد نصیر آبادی

بن محمد یٰسین، ولادت (نصیر آباد رائے بریلی) ۱۲۴۱ھ اساتذہ۔ مولوی سید محمد بن اعلیٰ نصیر آبادی، مولوی سخاوت علی جونپوری۔ تکمیل کے بعد سفر حج کیا اور وہاں شاہ محمد یعقوب دہلوی سے سندِ حدیث لی اور فیضِ باطن حاصل کیا۔ تلامذہ :۔ مولوی محمد جنید بن مولوی سخاوت علی جونپوری، مولوی محمد شبلی بن مولوی سخاوت علی جونپوری مولوی قاضی محمد بن عبد العزیز مچھلی شہری، مولوی بخشش احمد قاضی پوری، مولوی فیض اللہ محرمی، مولوی فیض اللہ اورنگ آبادی وغیرہ۔

وفات ۱۲۸۹ھ۔ نزہۃ الخواطر الجزء السابع ص۳۸

مولانا سید غوث علی شاہ

اِن کے اجداد روم سے ملتان (اوچھ) وارد ہوئے تھے۔ ان کے دادا سید ظہور الحسن صوبہ بہار میں استھاواں ضلع مونگیر میں

متوطن ہوگئے تھے۔ ان کے والد سید احمد علی تھے۔ مولانا غوث علی شاہ کی ولادت ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء میں ہوئی۔ ابتدائی فارسی و عربی کی تعلیم کے بعد والد (سید احمد علی) کے پاس دہلی آگئے اور یہاں ایک سبق کافیہ کا شاہ محمد اسماعیل سے اور باقی کتابیں مولانا فضل امام خیرآبادی سے پڑھیں۔ شاہ محمد اسحاق اور شاہ عبدالعزیز سے حدیث پڑھی۔ درسیات کی تکمیل نہیں کرسکے تھے کہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور سیاحت کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا۔ آخر میں ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۲ء میں پانی پت میں مقیم ہوگئے۔ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں وصال فرمایا۔ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کے جانشین مولانا گل حسن شاہ ہوئے جنھوں نے آپ کے ملفوظات تذکرۂ غوثیہ کے نام سے مدون کیے۔ ماخذ۔ تذکرہ غوثیہ۔

مولانا سید علی احمد عظیم آبادی

وطن عظیم آباد (پٹنہ، بہار) ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں دہلی پہنچے۔ مولوی عبدالخالق دہلوی اور دوسرے اساتذہ سے فنون کی تکمیل کی پھر شاہ محمد اسحاق کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور حدیثِ نبوی کی قرارت و سماعت کی۔ حصولِ علم سے فراغت کے بعد تزکیۂ باطن کے لئے مولوی سید نصیرالدین دہلوی (شاہ رفیع الدین کے نواسے اور شاہ اسحاق کے داماد) کے ہاتھ پر بیعت ارشاد کی پھر شاہ صاحب اور مولوی صاحب کی ترغیب سے ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۵ء میں جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور براہِ سندھ، سرحد پہنچ کر مجاہدین سے جاملے۔ کچھ دن کے بعد ان کے مرشد بھی وہاں پہنچ گئے اور ان حضرات نے وہاں جاکر سرحد و غزنی وغیرہ میں سکھوں اور انگریزوں سے جہاد کیا۔ جب ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء میں مولوی سید نصیرالدین شہید ہوگئے تو مولانا سید علی احمد شکارپور لوٹ آئے، جہاں سرحد جاتے وقت ٹھہرے تھے وہاں ایک مقتدر دینی شخصیت شیخ محمد حیات سندھی (مرشد احمد شاہ ابدالی) کے گھرانے کی ایک خاتون سے عقد ہوگیا۔ سندھ سے اپنے رفقاءِ جہاد کی دعوت پر ٹونک منتقل ہوگئے جہاں نواب وزیرالدولہ نے ان کو اپنا میر منشی (پرائیویٹ سیکرٹری) بنالیا۔ برسوں اس عہدے پر رہے۔ نواب نے انہیں فخرالعلماء دبیرالملک کا خطاب دیا۔ نواب وزیرالدولہ کے بعد ان کے جانشین نواب محمد علی خاں کے عہد میں بھی اسی عہدے پر رہے۔ آخر عمر میں وظیفہ یاب ہوکر عبادت و ریاضت اور مریدوں کی تربیت میں مشغول ہوگئے۔ ۱۸۹۰ء میں

وصال فرمایا۔

شاہ اسحاق کی نظر میں مولانا کا جو علمی مقام تھا اس کا اندازہ شاہ صاحب کے اس جملے سے ہوتا ہے جو انہوں نے مولانا کو ایک خط میں لکھا تھا "مولوی علی احمد! تم نے ٹونک میں منشی گیری کی، اگر تم درس دیتے رہتے تو محدثینِ زمانہ کے چراغ تمہارے سامنے گل ہو جاتے۔" ٹونک میں بھی رئیسِ شہر اور عمائدِ ریاست پر مولانا کے فضل و کمال اور تدین و تقویٰ کا بڑا گہرا اثر تھا۔ صاحبزادہ اسفندیار خاں ابنِ نواب امیر خاں، صاحبزادہ احمد یار خاں، صاحبزادہ عبدالصبور خاں، مولوی علی اصغر آبرو وغیرہ مولانا سے بیعت تھے۔

مولانا ریاست کے اعلیٰ عہدے پر متمکن تھے۔ تنخواہ بھی اس دور کے لحاظ سے گراں قدر تھی مگر مولانا بہت سادہ زندگی بسر کرتے، کھادی کے کپڑے پہنتے تھے۔ اہلیہ اور اکلوتے صاحبزادے محمود احمد بھی صرف کھادی پہنتے تھے۔ مولانا کا انگرکھا بھی کھادی کا ہوتا تھا مگر جب انگرکھا پہنتے تو کرتا اُتار دیتے تھے کہ یہ اسراف ہے۔ راستہ میں جو ملتا اسے سلام میں پہل کرتے تھے۔ گھر سے باہر نکلتے تو ہمسایوں کے گھروں پر آواز دیتے ہوئے نکلتے کہ بازار جا رہا ہوں کچھ منگانا ہو تو میں لا دوں گا۔

میاں نذیر حسین محدث آپ کے ہم وطن بھی تھے اور معاصر بھی مولانا جس زمانے میں شاہ محمد اسحاق سے درسِ حدیث لے رہے تھے میاں صاحب، مولوی عبدالخالق سے پڑھ رہے تھے ملاقاتیں اور طالب علمانہ مباحثے بھی رہتے تھے۔

مولانا سید علی احمد کی نرینہ اولاد زندہ نہیں رہی۔ آپ کے ایک نواسے علامہ سید مختار احمد تھے (ولادت ۱۸۷۵ء۔ ف ۱۹۴۱ء) جو حیدرآباد دکن کے مشاہیر اہلِ قلم میں سے تھے۔ متعدد محققانہ کتابوں کے مصنف اور دکن کی متعدد علمی مجالس کے رکن تھے۔ نظام نے ان کو "مخطوط عثمانی" کا خطاب اور تاحیات ماہانہ وظیفہ برائے علمی مشاغل مقرر کیا تھا۔ لغات القرآن، معیار الفصاحت، قاموس الاغلاط وغیرہ متعدد تصانیف طبع ہو چکی ہیں۔ زیادہ کتابیں غیر مطبوعہ ہیں جن میں ایک لغت بھی ہے جو ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

مولوی عبداللہ الہ آبادی مولوی عبداللہ صدیقی الہ آبادی۔ ولادت مئو (الہ آباد) اپنے عہد کے اساتذہ سے تحصیل علم کی پھر دہلی پہنچے اور شاہ محمد اسحاق سے استفادہ کیا۔ زیرِ تعلیم کتب مع حواشی و تعلیقات اپنے ہاتھ سے نقل کرتے تھے۔ نزہۃ الخواطر ۷۔ ۳۰۴

مولوی ظہور محمد کالپوی ظہور محمد بن خیرات علی بن حسین علی حسینی ترمذی کالپوی۔ ولادت ۱۲۱۳ھ میں۔ تحصیلِ علوم پہلے اپنے شہر کے اساتذہ سے پھر لکھنؤ میں مولوی ولی اللہ لکھنوی، مولوی حیدر بن معین اور مولوی حسن علی شافعی سے کی پھر دہلی میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق سے تکمیل کی۔ پھر حجاز جا کر شیخ عابد سندھی سے صحیحین پڑھیں۔ وفات ۱۲۸۰ھ

نزہۃ الخواطر (۷۔ ۲۲۸) حوالہ (۱) ضیاء محمدی و (۲) تقصار جیوڈ الاحرار از نواب صدیق حسن خاں۔

مولوی خواجہ ضیاء الدین احمد دہلوی آپ شاگرد رشید اور خلیفۂ طریقت بھی ہیں۔ مقالاتِ طریقت ص ۲۴۱

مولوی عبداللہ جھاؤ شجرۂ مبارکہ۔ تذکرہ علماء مبارک پور ص ۴۵

شاہ محمد عمر دہلوی شاہ محمد اسماعیل کے فرزند وحید تھے۔ مولوی عبدالحی کا بیان ہے کہ قناعت وعفاف و توکل و استغنا اور تبتل الی اللہ کی صفات سے بہرہ مند تھے۔ دنیا اور اربابِ دنیا کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار بہادر شاہ ظفر نے شوقِ ملاقات ظاہر کیا اور لال قلعہ آنے کی دعوت دی مگر آپ نے مسترد کر دی۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی فرماتے ہیں کہ ایک بار ہمارے ساتھ جا رہے تھے کہ بادشاہ کی سواری کا ڈنکا سنائی دیا، جسے سن کر شاہ محمد عمر کی رنگت زرد پڑ گئی اور وہ اضطراب میں پیشاب کرنے بیٹھ گئے۔ جب سواری گزر گئی تو وہ اٹھے اور خوف و اضطراب دور ہو چکا تھا۔ پوچھنے پر فرمایا کہ مجھے خوف آیا کہ بادشاہ کی سواری اپنے ساتھ میرا ایمان نہ لیتی جائے۔

مولانا کیرانوی کی یہ بھی روایت ہے کہ والئ ٹونک نواب وزیر الدولہ شاہ محمد عمر کے معتقد تھے اس لئے ان کی زیارت کے لئے پہنچے۔ شاہ محمد عمر نے سنا تو دیوار پھاند کر پچھواڑے کی طرف نکل گئے کہ امیروں کی ملاقات سے دل سیاہ ہو جاتا ہے اور قلب پر غفلت طاری ہو جاتی ہے۔

شاہ محمد عمر کی وفات ۲ رجمادی الثانی ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں ہوئی۔ مومن خاں نے قطعۂ تاریخ وفات کہا۔

محمد عمر کا ہوا انتقال — مجھے سالِ تاریخ کا تھا خیال
بزرگ ایسے ہوتے ہیں پیدا کہاں — کہ سب نے کہا "مرگِ شیخِ زماں"
۱۲۶۸ھ

نزہتہ الخواطر (۷-۳۴۰) مرقاۃ الیقین از اکبر شاہ خاں ص ۱۹۳-۱۹۴۔ مقالاتِ طریقت ص ۲۳۔ مقدمہ فتاوی عزیزی از مرزا محمد بیگ دہلوی ص ۱۲۔

جانشین شاہ اسحاق

شاہ اسحاق کی ہندوستان سے حجاز ہجرت کے بعد ان کی خلافت و ولایت کا بار کس نے اُٹھایا؟ اس میں اختلافات ہیں۔ ایک طرف شاہ صاحب کے چند تلامذہ کے نام لئے جاتے ہیں اور دوسری طرف میاں نذیر حسین محدث دہلوی ہیں جن کے معتقدین ان کی خلافت کے مدّعی ہیں۔ ہم پہلے میاں صاحب کی خلافت پر غور کریں گے۔

خلافت کی تحقیق سے پہلے خود میاں صاحب کے تلمّذ پر کلام کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ شاہ صاحب کے بعض تلامذہ کو اس سے انکار تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادعائے خلافت شاہ صاحب کی ہجرت مکہ معظمہ (۱۲۵۸ھ/۱۸۴۱ء) ہی نہیں وصال ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء بلکہ شاہ یعقوب کے بھی وصال (۱۲۸۲ھ/۱۸۶۶ء) کے بھی بعد کیا گیا تھا۔ اور جب ان کی خلافت ہی نہیں تلمّذ کے بارے میں انکار و اشتباہ کا آوازہ بلند ہوا تو میاں صاحب نے ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۶ء میں ایک تحریر شائع کی اور اپنے دو خواجہ تاشں اور رفقائے مدرسہ کے بیانات بھی حاصل کئے جو اسی سنہ کے ہیں۔ اور شاہ صاحب کی عطا کردہ سند شائع کی۔

میاں صاحب اپنے تلمّذ کی داستان یوں بیان فرماتے ہیں۔ [1]

ایں عاجز... در ۱۲۴۳ھ در شاہجہاں آباد — میں ۱۲۴۳ھ میں دہلی ... آیا اور مقیم ہوا...

[1] الحیات بعد الممات (مولفہ فضل حسین بہاری) طبع کراچی، ۱۹۵۹ء ص ۴۸ و مابعد

...حاضر بودہ اقامت گزیں شدہ .... بخدمت مولانا
عبدالخالق صاحب مرحوم حاضر بودہ طرح تحصیل علوم
رسمیہ انداختم و بعرصہ سہ و نیم سال علوم رسمیہ را
از مولوی جلال الدین صاحب مرحوم و از مولوی
شیر محمد قندھاری مرحوم و از محمد سعید پشاوری مرحوم
و مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم حاصل کردہ و
فراغت نمودہ بقصد تحصیل علم حدیث و فقہ ہمہ
تن متوجہ شدم و در سن ششم از وقت اقامت دہلی
(۱۲۴۸ھ) عقد مناکحت بستم .... و در ہماں
سال ہمراہ مولوی عبداللہ سندھی و مولوی محمد گل
کابلی و مولوی نور علی متوطن سرداں و حافظ محمد
فاضل سورتی و حافظ حاجی محمد مرحوم صحیح بخاری
بوقت صبح از جناب مولانا محمد اسحاق صاحب
شریک شدم و اکثر سامع بودم و کمتر قاری و از
جناب مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم مع مولوی
رحمت اللہ بیگ نیز صحیح بخاری آغاز کردم و جائے
کہ شک و شبہ دریں جا می ماند علی الصباح در سبق
نزد مولانا ممدوح مغفور حل آں می کردم آخر الامر
در ہفت ماہ نزد مولوی صاحب مرحوم و در عرصہ
نُہ ماہ از مولانا مغفور و مرحوم کتاب مذکور باختتام
رسید و در صحیح مسلم ہمیں معاملہ رو داد .... وقت
معتاد معہود من بخدمت مولانا صبح گاہ بود و مولوی
یار علی صاحب ہم وطن من و مولوی قطب الدین

مولانا عبدالخالق صاحب کی خدمت میں حاضر
ہو کر علوم رسمیہ کی تحصیل کا سلسلہ شروع کیا اور
ساڑھے تین سال میں جلال الدین صاحب
مرحوم، مولوی شیر محمد قندھاری مرحوم، محمد سعید
پشاوری مرحوم اور مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم
سے حاصل کئے اور فراغت پا کر علم حدیث و فقہ
حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوا اور قیام دہلی کے
چھٹے سال (۱۲۴۸ھ) میرا نکاح ہوا.... اور اسی
سال مولوی عبداللہ سندھی، مولوی محمد گل کابلی،
مولوی نور علی متوطن سرداں حافظ محمد فاضل
سورتی و حافظ حاجی محمد جونپوری مرحوم کے ساتھ
مولانا محمد اسحاق صاحب کے پاس صحیح بخاری کے
درس میں جو صبح کو ہوتا تھا شریک ہوا۔ میں اس
درس میں اکثر سماعت اور کبھی کبھار قرارت بھی
کیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ مولوی عبدالخالق
صاحب مرحوم کے پاس بھی مولوی رحمت اللہ
بیگ کے ساتھ میں نے صحیح بخاری شروع کی یہاں
مولوی (عبدالخالق کے درس میں) جہاں شک و
شبہ رہ جاتا تھا مولانا ممدوح و مغفور کے درس
میں صبح اس شک و شبہ کو دور کر لیتا تھا۔ بالآخر
مولوی عبدالخالق مرحوم کے پاس سات مہینے میں
اور مولانا مرحوم و مغفور کے پاس نو مہینے میں صحیح
بخاری ختم ہوئی۔ صحیح مسلم میں بھی درس کی یہی صورت

خاں مرحوم و مولوی علی احمد صاحب ہم وطنے کہ در ٹونک بہ دربار نواب وزیر الدولہ مرحوم برعہدۂ میر منشی ممتاز اند بعد نماز ظہر صحیح بخاری می خواندند و در آں وقت یعنی بعد نمازِ ظہر حاضر نمی شدم و شریک شاں نبودم.... ہر گاہ نزد مولانا مرحوم ہدایہ شروع شد ندر یں کتاب نواب صاحب مرحوم و مولوی بہار الدین دکھتی و والد ماجد قاضی محفوظ اللہ پانی پتی و مولوی قاری حافظ کرم اللہ مرحوم... شریک ہدایہ شدند و ایں عاجز ہم در ہدایہ شریک ایشاں بود بعد نصفے ہدایہ در جامع صغیر شریک شاں شدم و لیکن جامع صغیر پنج و شش جز خواندہ شد و ایں عاجز کنز العمال علی متقی تن تنہا دو سہ جز از مولانا مرحوم خواندہ .... در زمانے کہ مولوی محمد ابراہیم نگر ہنسوی دہلی آمدہ قدرے تفسیر بیضاوی و صحیح بخاری تمام نمودند من ہم شریک سماعت ایشاں بودم تمام و بکمال آں شنیدم و لہٰذا مولانا مرحوم در سند من ارقام فرمودہ اند کہ سمع منی الاحادیث الکثیرہ۔

رہی .... مولانا کے پاس درس کا وقت صبح مقرر و طے تھا اور میرے ہم وطن مولوی یار علی صاحب اور مولوی قطب الدین احمد خاں مرحوم اور میرے ہم وطن مولوی علی احمد صاحب جو نواب وزیر الدولہ مرحوم والیٔ ٹونک کے دربار میں میر منشی کے عہدہ پر سرفراز ہیں۔ یہ لوگ مولانا سے صحیح بخاری بعد نماز ظہر پڑھتے تھے اور میں ان کے ساتھ شریک نہیں تھا۔ جب مولانا کے پاس ہدایہ شروع کی تو اس کتاب میں نواب قطب الدین صاحب مرحوم مولوی بہار الدین دکھتی اور قاضی محفوظ اللہ پانی پتی کے والد ماجد (مولوی صفۃ اللہ) اور مولوی قاری حافظ کرم اللہ.... ہدایہ میں شریک ہوئے میں بھی ان حضرات کا شریک ہوا نصف ہدایہ تک پڑھنے کے بعد میں جامع صغیر میں ان حضرات کا شریک ہوا لیکن جامع صغیر پانچ چھ جز ہی پڑھی گئی اور میں نے کنز العمال از علی متقی دو تین جز تنہا مولانا مرحوم سے پڑھی .... جس زمانے میں مولوی ابراہیم نگر ہنسوی نے دہلی آکر قدرے تفسیر بیضاوی اور کامل صحیح بخاری پڑھی۔ میں بھی ان کا شریک ہو گیا اور مکمل بخاری شریف کی سماعت کی۔ اس لئے مولانا مرحوم نے میری سند میں سمع منی الاحادیث الکثیرہ (مجھ سے بہت سی حدیثیں اس نے سنی ہیں) تحریر فرمایا ہے۔

میاں صاحب کے اس بیان میں حسب ذیل امور تنقیح طلب ہیں۔

میاں صاحب نے شاہ صاحب سے اپنے آغازِ درس کا سال ۱۲۴۳ھ بتایا ہے۔ مگر

دوسری جگہ[1] لکھا ہے کہ "دوازدہ سیزدہ سال بہ صحبت مولانا فیض شدم" حالانکہ ۱۲۴۸ھ کے بعد سے شاہ صاحب کے سال ہجرت (۱۲۵۸ھ) تک "دوازدہ سیزدہ سال" نہیں ہوتے۔

(۲) بیک وقت دو اساتذہ سے ایک ہی کتاب کا درس لینا، درس گاہی تعامل و رواج کے بھی خلاف ہے اور بظاہر غیر ضروری بھی ہے خصوصاً جبکہ (الف) ایک استاد (مولوی عبدالخالق) دوسرے (شاہ صاحب) کے شاگرد بھی تھے۔ (ب) مولوی عبدالخالق کے درس میں شکوک بھی رہ جاتے تھے جو شاہ صاحب سے حل کرنا پڑتے تھے۔

(۳) میاں صاحب نے بخاری، مسلم، ہدایہ، جامع الصغیر اور تفسیر بیضاوی میں جن حضرات کو اپنا شریک درس بتایا ہے شہادت ان کے بجائے دوسرے دو حضرات شیخ محمد محدث تھانوی اور مولانا علی احمد سے کیوں دلوائی۔ (ان دونوں نے جو شہادت دی ہے اس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔)

(۴) ایک ہی کتاب (بخاری شریف) کے درس میں استادوں کے ساتھ ان کے شرکاء درس کیوں مختلف تھے؟ مولوی عبدالخالق کے یہاں صرف مولوی رحمت اللہ بیگ شریک تھے اور شاہ صاحب کے یہاں پانچ دوسرے حضرات۔

(۵) ہدایہ کے درس میں نواب قطب الدین خاں بھی میاں صاحب کے شریک تھے تو انہوں نے قاری عبدالرحمٰن پانی پتی سے یہ کیوں پوچھا تھا کہ

"انہوں نے (میاں صاحب) کس زمانے میں شاہ صاحب سے پڑھا ہے؟"

(۶) جب انہوں نے کنز العمال پوری پڑھی تھی تو شاہ صاحب نے سند[2] میں "شیئاً من کنز العمال" کیوں تحریر فرمایا تھا؟

(۷) جب بخاری و مسلم پوری پڑھی تھیں تو شاہ صاحب نے سند میں "اطرافاً من الصحاح الستۃ البخاری و مسلم" کیوں تحریر فرمایا؟

(۸) اس بیان میں میاں صاحب نے ترمذی کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ مولانا عبدالحی حسنی سے ۱۳۱۲ھ میں انہوں نے شاہ صاحب سے ترمذی پڑھنے کا بھی ذکر کیا تھا[3] اور مولوی

---

[1] الحیات بعد الممات ص۳۳ [2] ایضاً ص۱۶ [3] دہلی اور اس کے اطراف، مولانا عبدالحی حسنی ص۳۹۔

فضل حسین بہاریؒ[1] نے بھی درس ترمذی کا ذکر کیا ہے۔

میاں صاحب نے اپنی نسبت تلمذ کی صحت کے لئے دو شہادتیں پیش کی ہیں۔ پہلی شہادت شیخ محمدؒ محدث تھانوی کی ہے۔ محدث تھانوی اپنے ایک مکتوب مرقومہ ۱۲۹۲ھ میں لکھتے ہیں[2]

در ۱۲۴۸ھ می قدس اتفاق مخلص حاضری خدمت جناب استاذی استاذ الآفاق مولانا شاہ محمدؒ اسحٰق محدث دہلوی قدس سرہٗ جہت تحصیل وحصول سند گردیدہ درآں زماں جناب مولوی سید نذیر حسین صاحب حضور المناقب تحصیل علوم از جناب مولوی عبد الخالق صاحب مرحوم و مغفور می کردند ہر روز الآنادراً حاضر خدمت عالی حضرت استاذ مولانا ممدوح می شدند و حل مشکلات فن حدیث و تفسیر و فقہ وغیرہ بخوبی می کردند مگر بچشم خود ندیدم کہ بدرس قرآۃً یا سماعتاً درآں زماں بوقوع در آمدہ باشند مگر مرا بخوبی مسموع است کہ ہم پایۂ معائنہ است کہ سند اوشاں بمولانا بودہ است مگر اکثر اکتساب فن حدیث شریف در پیش خدمت مولوی عبد الخالق صاحب کردہ اند و سند جدید از پیش گاہ حضرت مولانا محمدؒ اسحٰق قدس سرہٗ می دارند . . . وقت رونق[3] افروزی حرمین شریفین بتقریب ہجرت مسموع است کہ ـــ براں یقین ست سند حوالہ مولوی سید نذیر حسین صاحب

۱۲۴۸ھ میں میری حضرت شاہ اسحٰق سے حصول سند کے لئے حضرت کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں مولوی سید نذیر حسین صاحب مولوی عبد الخالق صاحب سے تحصیل علم کر رہے تھے اور کبھی کبھار کے ناغہ کے علاوہ روزانہ شاہ اسحٰق کی خدمت میں حاضر ہوتے اور حدیث تفسیر فقہ کے مشکل مسائل بخوبی حل کرتے میں نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا کہ میاں صاحب اس زمانے میں سبق پڑھنے یا سننے کے لئے آئے ہوں مگر اچھی طرح سنا ہوں جو دیکھنے کے برابر ہے کہ میاں صاحب کے پاس شاہ صاحب کی سند ہے۔ شاید انھوں نے فن حدیث زیادہ تر مولوی عبد الخالق صاحب سے حاصل کیا ہے اور نئی سند شاہ اسحٰق کی بھی ان کے پاس ہے . . . سنا ہے اور سنے ہوئے پر یقین ہے کہ شاہ صاحب نے ہجرت کر کے حرمین شریفین جاتے وقت مولوی سید نذیر حسین صاحب کو سند عطا فرمائی تھی اور مجاز کیا تھا، بس لاتکتموا الشہادۃ (گواہی

---

[1] الحیات بعد الممات ص۷۵ [2] ایضاً ص۲۶ [3] ہمارے کیسے کیسے اکابر کی زبان قلم سے روانی و بے خیالی میں بعض مرتبہ کیسے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ شاہ اسحاق علیہ الرحمہ ہوں یا کوئی بڑے سے بڑا اہل اللہ کس کی مجال ہے جو حرمین شریفین کی رونق بڑھا سکے؟

فرمودہ اند و مجاز گردانیدہ فقط بجہت ولاتکتموا الشہادۃ ہرچہ معلوم مخلص بود بے کم وکاست وانمود آں. مکرم ہیچک واہم ازجانب مولوی سید نذیر حسین صاحب اندریں باب نیارند. ماراہم ہمیں قدر اعتماد نسبت اوشاں است بے دغدغہ شبہ تلمذ اوشاں یعنی مولوی نذیر حسین صاحب پایۂ اعتبار بخوبی می دارد۔

کو نہ چھپاؤ) کے حکم کے مطابق جو کچھ مجھے معلوم تھا بے کم وکاست لکھ دیا آپ (مکتوب الیہ) مولوی نذیر حسین صاحب کی طرف سے اس (سند کے) باب میں کوئی وہم نہ رکھیں۔ ہمیں بھی میاں صاحب کی نسبت اس قدر اعتماد ہے، مولوی نذیر حسین کا شاہ صاحب سے تلمذ شبہ سے بالاتر ہے اور معتبر ہے۔

محدث تھانوی نے اس شہادت میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے ہم نے یہ تاثر لیا ہے کہ ان کے نزدیک :-

(۱) میاں صاحب کے مولوی عبدالخالق سے استفادہ کی نوعیت وہ تھی جس کو تحصیل علم اور درس سے تعبیر کرتے ہیں اور

(۲) شاہ صاحب سے استفادہ کی نوعیت، عام استفادہ کی سی تھی جیسا کہ ایک شاگرد کا شاگرد، اپنے استاذ الاستاذ سے خالی اوقات میں کسی بھی جماعت طلباء کے درس کے دوران سوالات کے ذریعہ استفادہ کرکے ان مسائل کی تحقیق کرلیتا ہے جن کو اس کا براہِ راست استاد نہ سمجھا سکا۔ محدث تھانوی نے مولوی عبدالخالق سے استفادہ کو تحصیل علوم سے اور شاہ صاحب کے استفادہ کو حاضری اور حل مشکلات سے تعبیر کیا ہے اور بڑی صفائی و دیانتداری سے لکھ دیا ہے کہ انھوں نے میاں صاحب کو شاہ صاحب سے قرآۃً وسماعۃً درس لیتے ہوئے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہاں یہ بات سنی ہوئی ہے (اور حسن ظن اور قیاس علی نفسہ کی بنا پر) گویا کہ دیکھی ہوئی کہ شاہ صاحب نے ان کو سند دی تھی۔ گویا کہ سند بھی محدث تھانوی نے نہیں دیکھی تھی۔

دوسری شہادت مولوی سید علی احمد بہاری ثم ٹونکی کی ہے۔ یہ ایک خط ہے، جو مولانا حفیظ اللہ خاں صاحب کے خط کے جواب میں لکھا گیا ہے۔[1]

---

[1] الحیات بعد المات ص۴۲

از تحریر بعض محباں معلوم شد کہ بعض اہل علم و
طلبہ را اشباہے پیدا شدہ است دریں باب کہ
.... مولوی سید نذیر حسین صاحب سلمہ
اللہ تعالیٰ را سند کتب احادیث شریفہ از ....
حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب .....
حاصل است یا نہ بلکہ مولوی صاحب ممدوح سلمہ
اللہ تعالیٰ بر زیارت و خدمت و صحبت حضرت
مولانا مبرور نیز شرف شدہ .... لہٰذا نوشتہ
می شود کہ سند کتب احادیث شریفہ عطا فرمودہ
حضرت مولانا .... بدست مولوی صاحب ممدوح
موجود ست و حال خدمت و صحبت بر اہل
شاہجہاں آباد خصوصاً آنانکہ در مجلس شادی
کتخدائی مولوی صاحب ممدوح .... شریک
بودند اظہر من الشمس است کہ حضرت مولانا مبرور
.... رونق افروز بودند و حاضر باشی مولوی سید
نذیر حسین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ بخدمت حضرت
مولانا محمد اسحاق صاحب طاب اللہ ثراہ بچشم
خود دیدہ ام .... پس شبہ عدم رویت و زیارت
وہم محض است مکرر آں کہ تا آخر ش ۱۲۵۰ھ
ایں جانب نیز با شاہ جہاں آباد بود و حاضر باش
مولوی صاحب بخدمت مولانا صاحب می دید۔

بعض احباب کے خطوں سے معلوم ہوا ہے
کہ بعض علماء وطلبہ کو اس بات میں شک ہے کہ
مولوی سید نذیر حسین صاحب کو حضرت مولانا
محمد اسحاق صاحب سے سند کتب احادیث حاصل
ہے یا نہیں بلکہ (سرے سے) مولوی صاحب
ممدوح کو حضرت شاہ صاحب کی زیارت، خدمت
اور صحبت کا شرف بھی حاصل ہے یا نہیں؟ اس
لئے لکھا جاتا ہے کہ کتبِ احادیث کی سند جو
حضرت شاہ صاحب نے عطا فرمائی ہے وہ
مولوی صاحب ممدوح کے پاس ہے۔ (جس کا
جی چاہے دیکھ لے) اور شاہ صاحب کی خدمت
اور صحبت میں رہنے کا حال دہلی والوں خصوصاً
ان لوگوں کو جو مولوی صاحب کی شادی میں
شریک ہوئے تھے خوب معلوم ہے کہ مولانا
شادی میں شریک ہوئے تھے اور مولوی سید
نذیر حسین صاحب کی حضرت مولانا محمد اسحاق
صاحب کی خدمت میں حاضر باشی کو میں نے
اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لہٰذا مولوی صاحب
کے شاہ صاحب کو نہ دیکھنے اور زیارت ہی نہ
کرنے کا شبہ تو نرا وہم ہے۔ مکرر یہ کہ ۱۲۵۰ھ
کے اختتام تک میں خود دہلی میں تھا اور مولوی
صاحب کی شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر باشی کو میں نے خود دیکھا ہے۔

مولوی علی احمد صاحب نے اپنے اس بیان میں اس سوال کو تو بالکل ہی ٹال دیا ہے کہ میاں

صاحب کو شاہ صاحب نے سند بھی دی تھی یا نہیں؟ یہ کہہ کر گذر گئے ہیں کہ میاں صاحب سے سند لے کر دیکھ لو واقعی صاحب کی ہے یا نہیں۔ اور وہ سند کے متعلق اس سے زیادہ کوئی بات کہہ بھی نہیں سکتے تھے اس لئے کہ عطاءِ سند ۱۲۵۸ھ میں بیان کی جاتی ہے اور مولوی علی احمد صاحب نے ۱۲۵۰ھ میں دہلی چھوڑ دی تھی۔ رہا دوسرا سوال کہ بعض لوگوں کے نزدیک میاں صاحب کو شاہ صاحب کی زیارت و صحبت ہی نصیب نہیں ہوئی تو اس کے جواب میں مولوی علی احمد صاحب نے شہادت دی ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ میاں صاحب نے شاہ صاحب کی نہ صرف زیارت کی ہے بلکہ شاہ صاحب میاں صاحب کی شادی میں شریک ہوئے تھے اور میاں صاحب کو شاہ صاحب کی خدمت میں آتے جاتے میں نے خود دیکھا ہے "معلوم ہوتا ہے میاں صاحب کے ادعائے خلافت کے جواب میں اس وقت کے کسی گروہ نے ضد میں سرے سے اسی کا انکار کر دیا تھا کہ میاں صاحب کو شاہ صاحب کا لقا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اس گروہ کی زیادتی تھی جس کا مولوی علی احمد صاحب کی شہادت سے ازالہ ہو گیا۔ لیکن ہمارے زیرِ بحث مسئلہ یعنی میاں صاحب کے شاہ صاحب سے تلمذ کا اس خط سے کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ انکار کا ہی پہلو نکلتا ہے کیونکہ موقع و محل کا تقاضا یہ تھا کہ ہم صرف زیارت و صحبت کے نہیں تلمذ و تعلم کے گواہ ہیں۔ مگر وہ لکھتے تو جب کہ انہوں نے پڑھتے ہوئے دیکھا ہوتا۔ انہوں نے میاں صاحب کو شاہ صاحب کے آستانہ پر آتے جاتے دیکھا تھا اس کی شہادت دیدی نتیجہ یہ نکلا کہ میاں صاحب نے شاہ صاحب کے تلمذ کے سلسلہ میں خود جو کچھ تحریر کیا ہے اس میں جھول ہے۔ پھر اُن کے بیان اور شاہ صاحب کی مبینہ سند میں بھی مطابقت نہیں ہے۔ میاں صاحب نے اپنی حمایت میں جن دو متدین بزرگوں کو شاہد کی حیثیت سے پیش کیا ہے ان بزرگوں نے اپنے تدین ہی کی بنا پر آدابِ شہادت کو ملحوظ رکھا اور جو کچھ علم میں تھا بیان کر دیا۔ محدث تھانوی نے تو استفادہ کرتے اور مشکلات حل کرتے دیکھا تھا۔ اگرچہ باقاعدہ درس لیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا مگر مولوی علی احمد صاحب نے تو استفادہ کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا صرف آتے جاتے دیکھا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ چاہے میاں صاحب اپنے دعوے میں بجانبِ حق ہوں مگر وہ استدلال اور استشہاد میں ناکام رہے۔

اب میاں صاحب کے تلمّذ کے متعلق ان کے معاصرین اور رفقائے مدرسہ کی آرا ملاحظہ ہوں۔ قاری عبد الرحمٰن پانی پتی شاہ صاحب کے مشہور اور خاص شاگرد تھے۔ مولف الحیات بعد الممات نے بھی اُن کا نام شاہ صاحب کے تلامذہ کی فہرست میں درج کیا ہے اور انہیں میاں صاحب کا بعض مواقع کا ساتھی (درس میں) لکھا ہے[۵۱]۔ وہ لکھتے ہیں[۵۲]:

"سید نذیر حسین اور حفیظ اللہ خاں صاحب کبھی کبھی مسئلہ پوچھنے کو یا کوئی لفظ جلالین کا پوچھنے کو جاتے تھے خدمت میں جناب مولانا اسحاق صاحب قدس سرہ کی اور بوقت ہجرت ایک ایک حدیث پانچ چھ کتابوں کی میاں صاحب کو سُنا کر ایک پرچہ بطور سند کے لیا اور حفیظ اللہ خاں صاحب کو تو یہ بھی نصیب نہیں ہوا۔"

دوسری جگہ یہی بات دہرائی ہے[۵۳]:

سید نذیر حسین صاحب نے کس روز میاں صاحب سے پڑھا ہے؟ فقط ہجرت کے ایام میں بطمع اغوائے خلق کے ایک ایک حدیث، اوائل چند کتب حدیث کی سُنا کر ایک پرچہ سند کا لکھوا لیا۔ ممکن ہے وعظ میں کبھی جانا نصیب ہوا ہو اور کبھی تعطیل میں مسئلہ پوچھنے کو جاتے تھے۔

قاری صاحب نے اپنے انکار کے ساتھ اپنے نامور خواجہ تاش نواب قطب الدین خاں کا استفہام انکاری بھی نقل کیا ہے[۵۴]:

"(میں نے) کبھی ان لوگوں کو (سید میاں نذیر حسین اور مولوی حفیظ اللہ) پڑھتے نہیں دیکھا بلکہ ایک مرتبہ قطب الدین خاں صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا کہ مولوی نذیر حسین صاحب اپنے تئیں میاں صاحب کا شاگرد بتاتے ہیں۔ انہوں

---

[۵۱] الحیات بعد الممات ص۵، ص۴۴۔ [۵۲] کشف الحجاب، طبع لکھنؤ ۱۲۹۸ھ ص۶۔ [۵۳] ایضاً ص۱۲

[۵۴] نواب شروانی سے ملاقات میں فرمایا جس روز میاں صاحب ہجرت کر کے روانہ ہوئے اس روز یہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند کتابوں کے اوراق کی ایک ایک حدیث پڑھی اور پڑھ کر کل کتابوں کی اجازت حاصل کی۔ میاں صاحب نے ایک چھوٹے سے کاغذ پر یہی واقعہ لکھ کر دے دیا۔ اس مدرسہ میں اس سے پہلے وہ پڑھنے کو کبھی نہیں آئے۔ کوئی مسئلہ پوچھنا ہوتا تو دوسرے یا تیسرے دن آ جاتے تھے۔ ص۳۲ مقالاتِ شروانی (نواب شروانی) علی گڑھ ۱۹۴۴ء۔

نے کس زمانہ میں میاں صاحب سے پڑھا ہے ؟"

نواب صاحب کا یہ استفہام بڑا حیرت انگیز ہے کیونکہ میاں صاحب نے جیسا کہ پہلے گذرچکا ہے۔ نواب صاحب کو ہدایہ اور جامع صغیر میں اپنا شریکِ درس بتایا ہے۔ فرماتے ہیں:[1]

از شریک شدن در ہدایہ از جناب مولوی صاحب مرحوم سلسلہ محبت والفت وارتباط وانبساط روز بروز دراز گردید۔	مولوی صاحب کے ساتھ ہدایہ میں شریک ہونے کے بعد الفت ومحبت اور شگفتگی تعلقِ خاطر کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔

اور نواب صاحب پوچھتے ہیں انہوں نے کس زمانہ میں میاں صاحب (شاہ صاحب) سے پڑھا ہے ؟

مختصر یہ ہے کہ میاں صاحب کے کسی رفیقِ درس نے ان کے تلمذ کی شہادت نہیں دی۔ مولوی علی احمد صاحب، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، نواب قطب الدین خاں وہ حضرات ہیں، جنہیں میاں صاحب نے شرکاءِ درس یا رفقاءِ مدرسہ بتایا ہے۔ مگر کسی نے بھی ان کو شاہ صاحب سے پڑھتے نہیں دیکھا۔

ان سب بیانات کے پیشِ نظر ہم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ میاں صاحب کو حدیث وفقہ میں اصلاً اور باقاعدہ تلمذ تو مولوی عبدالخالق سے تھا مگر وہ ایک نیاز مند، معتقد شاگرد کے شاگرد اور ایک ذہین ومحنتی طالب علم کی حیثیت سے شاہ صاحب کی بزمِ درس وافتا کے حاضر باشوں میں سے تھے اور ہر ہونہار طالب علم کی طرح اگرچہ اُن کی دلی اور شدید خواہش ہوگی کہ وہ براہِ راست شاہ صاحب کے تلامذہ کے حلقہ میں محسوب اور داخل ہوجائیں اور ایک بہتر اور اعلیٰ معلم سے منسوب ومستفید ہوں اور سند بھی عالی حاصل ہو۔ مگر قدیم درس گاہی نظام کی بے لچک روایات اور بعض مجبوریاں اس شوق وخواہش کی تکمیل میں حارج تھیں۔ عہدِ ماضی کے اساتذہ اپنی خواہش یا طالب کی گذارش کے باوجود ایسے طلبہ کو خواہ وہ کتنے ہی ہونہار، مستحقِ توجہ اور التفات طلب کیوں نہ ہوں ایسے حلقۂ درس میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے جو اُن کے کسی دوست، کسی استاد یا کسی شاگرد کے حلقۂ درس میں شامل ہو، یہ قدیم

مدارسؒ کی ایک روایت تھی اور اس روایت کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ میاں نذیر حسین صاحب ابتدا سے مولوی عبدالخالق کے ممنونِ احسانات تھے پھر وہ ان کے خویش بھی ہو گئے تھے اس لئے وہ شاہ صاحب کے حلقۂ درس کے شمول کی شدید خواہش کے باوجود نہ زبان سے اس خواہش کا اظہار مولوی عبدالخالق سے کر سکتے ہوں گے نہ شاہ صاحب سے کہنے کی جرأت ہوتی ہو گی اور اگر کسی وقت کہہ بھی گذرے ہوں گے تو شاہ صاحب نے اپنے شاگرد مولوی عبدالخالق کے فضل وکمال کا بیان کر کے انہی سے منتظم رہنے کا مشورہ دیا ہو گا۔ مایوس ہو کر میاں صاحب نے اس کا یہ عملی حل نکالا ہو گا کہ شاہ صاحب کے حلقۂ درس میں غیر قانونی بے قاعدہ اور بالائے ضابطہ شرکت کا سلسلہ شروع کر دیا ہو گا اور یوں مولوی صاحب کی لاج بھی رکھ لی۔ شاہ صاحب کی بات بھی مان لی اور اپنی خواہش بھی پوری کر لی اور کمی بھی رفع کر لی۔ مولوی عبدالخالق شاہ صاحب کے عزیز و سعید شاگرد تھے۔ ہم فکر و ہم مسلک بھی تھے۔ میاں نذیر حسین جنہیں بعد میں ایک نامور مدرس اور مستقبل کا محدثِ وقت اور ایک معرکہ آرا شخصیت بننا تھا اپنے عہدِ طلبِ علم میں دہلی کے ایک ممتاز طالبِ علم ہوں گے۔ ان کی شہر میں ایک بین المدارسی حیثیت ہو گی۔ اس

لہ ہمارے خاندان میں بھی ایسے نازک مواقع پیش آئے۔ میرے دادا مولانا حکیم دائم علی عظیم آبادی پہلے اپنے عزیز بزرگ مولانا محمد احسن گیلانی سے پڑھتے تھے۔ مولانا دائم علی، مولانا گیلانی کی زبان سے اپنے استاذ علامہ فضل حق خیر آبادی کے محاسن و محامد روز سنا کرتے تھے اور سن سن کر ہی علامہ کے شیفتہ ہو گئے تھے۔ بسا کیں دولت از گفتار خیزد، اس شیفتگی نے یہ سجھائی کہ علامہ بقیدِ حیات اور لکھنؤ میں مقیم ہیں کیوں نہ سندِ عالی کے حصول کے نادر موقع اور بہ سے بہتر معلّم سے استفادہ کی سہولت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ مولانا گیلانی سے فرار ہو کر لکھنؤ جا پہنچے، اور وہاں علامہ سے اس بات کا اظہار نہیں کیا کہ وہ مولانا گیلانی سے پڑھتے رہے ہیں کیونکہ انہیں یقین تھا کہ علامہ انہیں گیلانی واپس کر دیتے۔ اس قسم کا واقعہ مولانا حکیم سید احمد حسین برکاتی (مقیم ڈھاکہ) بڑے لطف سے بیان فرماتے ہیں۔ وہ پہلے مولانا مقبول احمد خاں دربھنگوی سے پڑھتے تھے۔ مولانا دربھنگوی نے بھی اپنی روزانہ غیر درسی گفتگوؤں کے ذریعہ اپنے استاد مولانا برکات احمد کا اتنا والہ و گرویدہ اور ان سے استفادہ کا اتنا مشتاق بنا دیا کہ مولانا احمد حسین دربھنگہ (بہار) سے ٹونک جا پہنچے۔ فرماتے ہیں کہ کئی سال تک حکیم صاحب کو یہ نہیں بتایا کہ مولانا مقبول احمد خاں سے پڑھ چکا ہوں ورنہ دربھنگہ لوٹا دیا جاتا۔ مولانا معین الدین اور مولانا برکات احمد میں بھی ایک بار ایک ذہین شاگرد مولوی محمد حسین کے سلسلہ میں یہ کشمکش چند ماہ تک رہی تھی اور احساسات کی نزاکت تک بات پہنچ گئی تھی۔ مگر تینوں فریقوں کی ہوش مندی، شرافت اور سعادت نے آزمائشوں سے بچا لیا۔ ہمارے اساتذہ اپنے اساتذہ کے قصائد روزانہ اس ذوق و شوق، اس کثرت و تواتر اور اس "شدت" سے کرتے تھے کہ بے چارے طلبہ اپنے استاذ الاستاذ کے یہاں پہنچ جانے کے لئے بیتاب ہو جاتے تھے اور ان مدرسین کو اپنے اساتذہ کی مدح سرائیوں کی یہ "سزا" ملتی تھی کہ وہ اپنے ہونہار، ذہین اور رجانِ جماعت طلبہ کو کھو بیٹھتے تھے۔

لئے جو لوگ قدیم اساتذہ کے طرزِ فکر اور ذہن سے واقف ہیں وہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہ شاہ صاحب کی نظر میں کیا ہوں گے۔ ان سے شاہ صاحب کو وہ اُنس بھی ضرور رہو گا جو ایک صحیح و شفیق معلّم کو ایک بلانوش متعلّم سے ہوتا ہے۔ خود میاں صاحب شاہ صاحب سے قربت کے لئے بھی مساعی رہتے تھے۔ قاری عبدالرحمٰن کا بیان[1] ہے کہ وہ شاہ صاحب کے سامنے خود کو ایک پُرجوش حنفی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ مولوی علی احمد صاحب کا بیان ہے کہ ایک دن اُن کے اور میاں صاحب اور ایک طالب علم کے درمیان شاہ صاحب کے سامنے ایک مسئلہ پر مباحثہ بھی ہو گیا تھا اور شاہ صاحب سنتے رہے تھے[2]۔ ان واقعات وجذبات کی بنا پر شاہ صاحب نے میاں صاحب کو مولوی عبدالخالق سے رشتہ توڑنے اور ان کی درسگاہ چھوڑ کر مدرسہ رحیمیہ میں چلے آنے کی اجازت تو یقیناً نہیں دی ہو گی مگر بے قاعدہ استفادہ اور بالائے ضابطہ شرکتِ درس سے باز نہ رکھ سکے ہوں گے اس لئے ان کو قرأت کی جرأت و اجازت نہیں ہو گی اور میاں صاحب جو کتابیں مولوی عبدالخالق سے پڑھتے ہوں گے انہیں کتابوں کے درس میں شاہ صاحب کے یہاں بقول مولانا تھانوی ہر روز الّا نادرًا حاضر ہو کر اپنی تشنگی فرو کرتے، اپنی معلومات بڑھاتے اور اپنی مشکلات حل کرتے ہوں گے۔

مختصر یہ ہے کہ اس طرح وہ اپنے شوقِ فراواں، جوشِ طلب اور ذہانت کے بل بوتے پر بیک وقت مسجد اورنگ آبادی اور مدرسہ رحیمیہ کے طالب علم ہوں گے اور یوں وہ شاہ صاحب کے شاگرد محسوب بھی ہوتے ہوں گے اور نہیں بھی[3] اور آج بھی جب ہم اپنی علمی تاریخ کے اس سلسلہ پر غور کرنے بیٹھتے ہیں تو یہ کہے بغیر چارہ نہیں پاتے کہ وہ شاہ صاحب سے مستفید ہوئے ہیں۔ ان کے درس میں بیٹھے ہیں۔ اور اپنی طرف سے تو انہوں نے شاہ صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ بھی تہ کر لیا ہے۔ سوالات کر کے اپنی تسکین کی ہے۔ غیر درسی مجلسوں میں بھی بارہا پایا ہے۔ تقلید و ترکِ تقلید کی بات چھڑ گئی ہے تو احناف کی طرف سے اپنے

لہ کشف الحجاب ص۱۲

سلہ اگرچہ آپ (میاں صاحب) کو بالاستیعاب شاہ صاحب کے درس شرکت کا موقع نہیں ملا مگر اس میں شک نہیں کہ آپ کو حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں نسبتِ تلمذ ہے۔ محسن الملک علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۲ء بحوالہ الحیات ص۲۲۵

فتاویٰ اتفاق تحریر رد داده و خود مولانا مرحوم بنا بر امتحان و نیز کارگذاری مستفتیان سوالہا بمن سپرد می فرمودند برائے تحریر جوابات۔

کو نہیں ملی۔ اس طویل مدت میں صدہا فتاویٰ لکھنے کا اتفاق ہوا اور خود مولانا مرحوم میرے امتحان (فتویٰ نویس) اور فتوے پوچھنے والوں کا کام نکالنے کے لئے (آئے ہوئے) سوالات جوابات لکھنے کو میرے سپرد فرماتے تھے۔

اِس عبارت میں اگرچہ خلافت کے سلسلہ میں کوئی صراحت و دلالت نہیں مگر ہم چشموں اور رفقاء و شرکا میں اپنے امتیاز و تفوق اور آستانۂ شاہی میں اپنے تقرب کا جس انداز سے بیان ہے ممکن ہے وہی معتقدین کے لئے اس گمان کا موجب ہوا ہو کہ یہ التفاتِ خاص اور یہ "تکالیف" جانشینی کی تربیت کے لئے تھیں۔ چنانچہ ان کے سوانح نگار جناب فضل حسین بہاری لکھتے ہیں کہ جب شاہ اسحاق نے ہجرت کی تو اُن کے مشاہیر تلامذہ ملک میں موجود تھے لیکن:

"مولانا کے واقعی اور حقیقی جانشین اور مولانا شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد العزیز کے مسندِ درس کا مالک باوجود بے انتہا مخالفت اور مزاحمت کے مولوی سید نذیر حسین کے کوئی اور نہ ہو سکا یہاں تک کہ "میاں صاحب" کا لقب جو مولانا شاہ ولی اللہ کے خاندان کے واسطے مخصوص تھا اور بسلسلۂ جانشینی منتقل ہوتا ہوا مولانا شاہ محمد اسحاق تک پہنچا تھا وہ مولوی سید[1] نذیر حسین کے ساتھ اس طرح چسپاں ہو گیا کہ اب "میاں صاحب" اور نذیر حسین گویا دو مترادف لفظ ہوتے ہیں"[2]

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔[3]

مولانا شاہ عبد العزیز قدس سرہٗ محدث دہلوی کے خاندان کے سردار[4] کو دلی والے "میاں صاحب" کہتے تھے۔

"مولانا شاہ محمد اسحاق علیہ الرحمۃ جب ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے اور ان کی جگہ ان

---

[1] الحیات بعد الممات صـ۲۸۔ [2] خود مولوی نذیر حسین نے فرمایا تھا کہ میں خوش ہوں کہ ہر ایک مجھے "میاں صاحب" کہتا ہے۔ الحیات صـ۱۵ صـ۱۸۱۔ [3] الحیات صـ۲۔ [4] یہ صحیح نہیں ہے بلکہ اس خاندان کے سبھی افراد میاں صاحب کہلاتے تھے۔ شاہ اہل اللہ اور شاہ اسماعیل بھی میاں صاحب ہی کہلاتے تھے۔ ملاحظہ ہو جماعتِ مجاہدین، سیاسی تحریک، بسوانح احمدی، مکتوبات المعارف، طبع سہارنپور ۱۳۱۲ھ۔ بلکہ اسی خاندان سے نسبتِ ارادت کی وجہ سے سید احمد شہید بھی میاں صاحب کہلاتے تھے۔ جماعتِ مجاہدین صـ۱۳۷۔

مناصب پہلے ہی سے عطا کر دیئے جاتے ہیں۔

میاں صاحب شاہ صاحب کی جانشینی کے کم سے کم معیار پر بھی پورے نہیں اُترتے تھے۔ کیونکہ شاہ صاحب کی ہجرت کے وقت انہوں نے تدریس کا آغاز بھی نہیں کیا تھا[1] جبکہ اُن کے تلامذہ کثیر تعداد میں تیس تیس برس سے درسِ افادہ میں مصروف و معروف تھے۔ خود انہی کے خاندان میں مولوی مخصوص اللہ اور مولوی محمد موسیٰ تھے، شاہ محمد عمر تھے۔ خصوصاً مولوی مخصوص اللہ نے شاہ عبدالعزیز کے وعظ میں قرآن مجید و احادیثِ نبوی کی تلاوت و قرارت کی تھی اور عرصہ سے مدرسہ رحیمیہ میں درس دے رہے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک خاص بات یہ ہے - کہ میاں صاحب یا اُن کے معتقدین کی طرف سے خلافت کا دعویٰ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۲۹۰ھ[2] میں کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس دعویٰ خلافت کے جواب میں جب اُن کے تلمذ ہی کو معرضِ اشتباہ میں ڈال دیا گیا تو اُن کی طرف سے اپنے تلمذ کے ثبوت میں جو تحریر شائع ہوئی تھی وہ بھی سنہ ۱۲۹۲ھ کو مکمل ہوئی ہے اور شہادت میں اپنے دو رفقائے مدرسہ کے بیانات حاصل کئے تھے وہ بھی سنہ ۱۲۹۲ھ کے لکھے ہوئے ہیں اور یہ وہ دور ہے جب خود شاہ اسحاق (سنہ ۱۲۶۲ھ میں) اُن کے برادرِ خورد شاہ محمد یعقوب (سنہ ۱۲۸۲ھ میں) مولوی محمد موسیٰ (سنہ ۱۲۵۹ھ) مولوی مخصوص اللہ (سنہ ۱۲۷۱ھ) مولوی عبدالخالق (سنہ ۱۲۶۱ھ) غرض تمام خاص خاص تلامذۂ شاہی اور وہ سب لوگ جو جانشینی کے نسبتاً مستحق تھے اور جو ان کے دعوے کا سامنا کرسکتے تھے رخصت ہو چکے تھے۔ یہ بات خود اس دعوے کی صداقت کو مشتبہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ پھر بھی جو حضرات زندہ تھے انہوں نے سامنا کیا اور قاری عبدالرحمٰن پانی پتی تو مقابل ہی آگئے۔ مگر جن حضرات مولانا علی احمد اور شیخ محمد محدث کو میاں صاحب نے اپنا سمجھا تھا انہوں نے تدین و تقویٰ کا ثبوت دے کر بڑے ہی محتاط الفاظ میں حقیقتِ حال لکھ کر بھیجی۔

حلقۂ شاہی میں سے کوئی بھی کلیتاً ان کے ساتھ نہ رہا۔

الحاصل شاہ محمد اسحاق نے اپنے سفرِ ہجرت کے وقت نہ میاں سید نذیر حسین کو اپنا خلیفہ بنایا نہ وہ اس وقت تک اس کے اہل ہی تھے۔

[1] حیات بعد الممات صفحہ ۵۹ و صفحہ ۹۹۔ [2] سیاسی تحریک صفحہ ۱۳۴

جوش و عصبیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے ہم درس رفقاء سے مباحثہ کیا ہے جسے شاہ صاحب معلمانہ اور مربیانہ شفقت سے اور صلاحیتوں کے امتحان کے لئے سنتے رہے ہیں۔ پھر جب برسوں کے بعد شاہ صاحب ہجرت پر آمادہ ہوئے ہیں تو جہاں اور لوگوں نے اسناد حاصل کیں وہاں انہوں نے بھی درخواست کی جو منظور کر لی گئی اور شاہ صاحب نے انہیں سند عطا فرما دی۔ جس میں "قرأ منی اطراف الصحاح ستہ" کا جملہ چاہے قاری صاحب کے اس قول کی تصدیق کرتا ہو کہ

ایک ایک حدیث اوائل چند کتب حدیث کی سنا کر ایک پرچہ[1] سند کا لکھوا لیا ہے۔

مگر شیئاً من کنز العمال والجامع الصغیر کے الفاظ میں اوائل کا مفہوم متبادر نہیں ہوتا بلکہ ذہن باقاعدہ درس کی طرف ہی جاتا ہے چاہے وہ چند جز کا ہی کیوں نہ ہو۔ اور الجامع الصغیر کے بعد "وغیرھا" بھی ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ مذکورہ کتابوں کے علاوہ ایک دو اور کتابیں بھی جزاً یا کلاً پڑھی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قاری صاحب نے اس سند کا جس انداز سے ذکر کیا ہے وہ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت کے اس مقدس اجازت نامہ کے شایانِ شان ہے، نہ قاری صاحب کے، نہ شاہ صاحب کے۔

بہرحال میاں صاحب کو شاہ صاحب سے ایک نوع تلمذ کی نسبت یقیناً حاصل تھی اور شاہ صاحب کے زمرۂ تلامذہ میں محسوب کئے جا سکتے ہیں اور اب یہ طے کرنا ہے کہ کیا شاہ صاحب نے انہیں اپنا جانشین نامزد کیا تھا؟ انہوں نے اگرچہ فرمایا ہے کہ[2]

دوازدہ سیزدہ[3] سال بہ صحبت مولانا فیضیاب شدم از منہ کثیرہ کے بجز من عاجز از شاگردان مولانا مرحوم میسر نہ شد دریں ازمنہ مذکورہ صدر۔	میں بارہ تیرہ سال مولانا کی صحبت سے فیض یاب ہوا ہوں اور طویل مدت تک صحبت میرے علاوہ مولانا مرحوم کے کسی شاگرد

[1] یہ بھی سند دینے اور لینے والوں کا کوئی اجنبی اور انوکھا فعل نہیں تھا۔ اوائل کی سند تبرکاً دینے اور لینے کا رواج عام اور قدیم تھا خود شاہ اسحاق نے عمر بن عبد الرسول بن عبد الکریم مکی سے اوائل کی سند ہی لی تھی۔ [2] الحیات ص۵۶۔

[3] یہ بارہ تیرہ سال میاں صاحب کی بھول ہے۔ کیونکہ خود انہوں نے شاہ صاحب سے اپنے اولین ربط کی تاریخ ۱۲۴۳ھ بتائی ہے اور ۱۲۵۷ھ میں وہ ہجرت فرما گئے۔ اس طرح کل آٹھ سال ہوتے ہیں۔

اخذ عنہ الم یا خذ احد من تلامذہ ص۲۵ اتحاف النبیہ۔ حاشیہ بھوجیانی۔

کی درخواست کی، جواب سخت سُن کر نا اُمید ہوئے۔

اس عبارت کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

"تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب قطب صاحب میں جناب مولانا اسحاق صاحب نے ہجرت کے وقت چار روز توقف کیا۔ رؤسائے دہلی بھی بطور رخصت کے وہاں پر تھے۔ رئیسوں میں مولوی سید نذیر حسین صاحب نے عرض کیا۔ آپ دہلی کو اہلِ علم سے خالی کئے جاتے ہیں۔ کسی کو اپنی جگہ اپنا جانشین فرما دیویں۔ اپنے شاگردِ خاص سے جیسے مولوی عبدالخالق صاحب جو ایک شاگردِ قدیم ہیں۔ اور مولوی عبدالخالق صاحب بھی موجود تھے یہ سمجھا ہو گا کہ مولوی صاحب تو ضعیف ہیں۔ شاید مجھے اپنا خلیفہ فرما دیں گے۔ میاں صاحب نے غصّہ سے فرمایا کہ کونسی خدمت بادشاہی کی میں رکھتا تھا جو اپنا جانشین کر جاؤں۔ سیّد نذیر حسین صاحب خاموش ہو رہے۔ دوسرے دن پھر اسی مجمع میں عرض کیا کہ آپ کے بعد ہم کس سے پڑھا کریں۔ فرمایا جو لائق ہو گا وہ پڑھا دے گا۔ پھر رئیس دہلی بھی سید نذیر حسین کے معین ہوئے اور عرض کیا کہ اگر آپ کے بعد ہم کو کچھ شک ہوا کرے تو کس سے پوچھا کریں تو فرمایا قطب الدین خاں اور عبدالرحمٰن کو ہم نے حدیث پڑھا دی ہے اگر حاجت ہوا کرے تو اُن سے پوچھ لینا۔ جب سید نذیر حسین نے جواب نامرادی کا سُنا، نا امید ہو کر چپ ہو رہے۔"

ہماری رائے بھی یہی ہے کہ شاہ صاحب کی طرف سے میاں صاحب کی خلافت کوئی تحریر، کوئی اعلان، یا زبانی گفتگو میں کوئی اشارہ تک منقول نہیں ہے۔ جو سند حیات بعد الممات میں طبع ہوئی ہے نہ صرف یہ کہ اس میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں ہے بلکہ اعطار سند کا جو واقعہ خود میاں صاحب نے بیان فرمایا ہے اگر من و عن صحیح بھی ہو تو بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ مولانا آزردہ کو سند دیتے وقت اُن کا بھی خیال آگیا اور انہیں بھی سند لکھ کر دیدی۔[1] کھلی ہوئی بات ہے کہ جس شخص کو اس طرح سند دی جا رہی ہے اس کے متعلق سند دینے سے زیادہ کسی اور بات کا تصوّر تو کبھی آ ہی نہیں سکتا۔ جس شخص کو جانشین بنایا جاتا ہے وہ عرصہ تک موضوعِ فکر و نظر رہتا ہے۔ زیرِ تربیت رہتا ہے اور ما قبل خلافت کے اس کے حقوق

[1] حیات بعد الممات ص۵۳

کے روحانی بیٹے مولانا سید نذیر حسین علیہ الرحمۃ نے لے لی اور مسندِ درس وارشاد پر متمکن ہوئے تو اُن کو بھی لوگوں نے میاں صاحب ہی کے نام سے پکارا۔ کیونکہ جناب شاہ صاحب (عبدالعزیز) کی اولاد میں کوئی باقی نہیں رہا تھا۔"

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں۔[۱]

"بالآخر جن کے حقیقی جانشین تھے اُن ہی کی سرزمین پر مرنے اور گڑنے کو ترجیح دی۔"

مندرجہ بالا عبارتیں صرف ایک صاحب اور ایک کتاب سے نقل کی گئی ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمیں ان حضرات کے ادبیات کے مطالعہ کا موقع بہت ہی کم ملا ہے اور اس سلسلہ میں زیادہ تفحص اور مزید حوالوں کی ضرورت یوں بھی نہیں ہے کہ اس میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے کہ یہ حضرات میاں صاحب کو شاہ صاحب کا جانشین سمجھتے تھے اور ظاہر کرتے تھے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ چنانچہ حال ہی میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی فرماتے ہیں۔[۲]

ولما ھاجر الشاہ محمد اسحٰق الی الحرمین الشریفین سنہ ۱۲۵۸ھ عقبہ خلفہ خلیفۃ لہٗ فی اشاعۃ العلوم الحدیثیۃ علماً وعملاً۔

جب شاہ محمد اسحاق حرمین شریفین ہجرت فرما گئے تو میاں نذیر حسین اپنے علم اور عمل کی وجہ سے علوم حدیث کی اشاعت میں ان کے خلیفہ ہوئے۔

الحاصل یہ ہے کہ اہلِ حدیث حضرات آج تک میاں صاحب کو شاہ صاحب کا جانشین ثابت کرتے رہے ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ شاہ صاحب کے دوسرے تلامذہ ان کی جانشینی کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ مگر خلافت تو فرع ہے تلمذ کی اور وہ حضرات جب تلمذ ہی میں کلام کرتے ہیں تو ان کے نزدیک خلافت کا تحقق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی لکھتے ہیں۔[۳]

قطب صاحب میں نذیر حسین صاحب نے اپنے خسر کے پردے میں خلافت وجانشینی

---

[۱] اتحاف النبیہ ص ۲۸۔ [۲] مگر مولانا کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ فقرأ التفسیر الجلالین الصحیحین حرفاً حرفاً علی العلامۃ الشاہ محمد اسحاق۔ گویا جس بات کا دعویٰ خود میاں صاحب نے نہیں کیا اس کا دعویٰ مولانا حنیف صاحب فرما رہے ہیں۔ سند میں شاہ صاحب نے "اطرافاً" کا لفظ تحریر فرمایا ہے اور مولانا نے حرفاً حرفاً لکھ دیا۔

شاہ اسحاق کی خلافت پر اظہارِ خیال کرنے والوں میں دوسرا نام مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب نے جاتے وقت دہلی میں مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی (۱۲۸۹ھ) مولانا مظفر حسین کاندھلوی (۱۲۸۳ھ) اور مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنا دیا۔

تالیفات

شاہ صاحب کی حسب ذیل تالیفات بیان کی جاتی ہیں۔

مسائل اربعین ماۃ مسائل، ترجمۂ مشکوٰۃ، افتارِ ہندی، تذکرۃ الصیام۔ ان میں سے آخرالذکر دو کتابیں (افتارِ ہندی اور تذکرۃ الصیام) ناپید ہیں۔ اس لئے ہم پہلی تین کتابوں کا مفصل تعارف اور ان پر اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔

مسائلِ اربعین

یہ کتاب مولوی سید ابو محمد جالیسری نے تصنیف کی ہے۔ مولف کا بیان ہے کہ ۱۲۵۵ھ میں محمد زماں خاں متوطن بھیکم پور کول علی گڈھ، دہلی آئے اور ۳۵ مسائل بطور استفسار شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں پیش کر کے جواب باصواب مع نقل عبارت اور کتاب کی استدعا کی۔ شاہ صاحب نے خاکسار کو جو چند روز سے دہلی میں مقیم تھا ان سوالات کے جوابات کی تحریر املا پر مامور فرمایا۔ خاکسار نے حسبِ ایما شاہ صاحب پانچ دوسرے سوالات بڑھا کر مسائلِ اربعین فی بیان سنّت سید المرسلین نام رکھا۔ اس دیباچہ کے بعد ایک مقدمہ ہے جس میں شادی و غم میں طریقِ سنّت کی پیروی اور بدعات سے اجتناب کا بیان ہے۔ پھر چالیس سوالات و جوابات ہیں آخر میں ایک خاتمہ ہے۔

ہمارے علم کے مطابق اس کتاب کی پہلی اشاعت صفر ۱۲۶۱ھ میں ہوئی اور یہی ہمارے پیشِ نظر ہے۔ یہ مطبع محمدی دہلی میں باہتمام حاجی ولی محمد در چوک قدیم بمکان منوموچی متصل سرائے بیچ طبع ہوئی تھی۔ ضخامت ۸۰ صفحات، سائز ۵" × ۹"، زبان فارسی، آخر میں فہرست مضامین بھی ہے۔

دوسری بار[1] ۱۲۶۶ھ میں اور تیسری[2] بار مطبع مجتبائی دہلی میں ۱۳۴۸ھ میں شائع ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ لکھنؤ اور کلکتہ سے کئی بار یہ کتاب شائع ہو چکی ہے[3]۔

مسائلِ اربعین کے متعدد اردو ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ پہلا ترجمہ مع شرح مولوی سعدالدین عثمانی بدایونی نے ۱۲۵۶ھ میں تالیفِ کتاب کے ایک ہی سال بعد اور کتاب کی طباعت سے قبل ہی کیا تھا۔ یہ ترجمہ سب سے پہلے مطبع صدیقی بریلی سے اور پھر مطبع قیومی کانپور۔ قیومی کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۳۲ھ میں نکلا تھا۔ مطبع جوہر ہند دہلی سے ۱۳۰۰ھ میں جو ایڈیشن شائع ہوا تھا وہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔

ایک دوسرے مقام پر مولانا رشید احمد نے ذرا زیادہ صراحت الفاظ میں شاہ احمد سعید کی طرف اس کتاب کی نسبت سے انکار کیا ہے:-

شاہ (احمد سعید) صاحب سے تو بعید معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسائلِ اربعین کا جواب لکھیں ہاں یہ ممکن ہے کہ مائۃ مسائل (مسائلِ اربعین) کے دو چار مسئلوں سے ان کو خلاف ہو مگر یہ کہ سب سے خلاف ہو اور جواب میں کتاب لکھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو حلقہ وغیرہ سے کب فرصت تھی اسی لئے سبق اُن کے یہاں ناغہ ہوتے تھے۔

دوسرا ترجمہ مولوی محمد نظام شاہجہانپوری نے ۱۲۶۰ھ میں کیا اور ۱۲۶۶ھ میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ اس کی دوسری اشاعت ۱۳۶۲ھ میں اور تیسری ۱۳۶۷ھ/۱۳۷۹ھ میں علیگڑھ سے ہوئی تھی۔ اِس ترجمہ کے آخر میں شاہ محمد اسحاق کی مہر بھی ہے۔ جس پر "محمد اسحاق ۱۲۲۹ھ" کندہ ہے۔ دوسری مہر مولوی سید محبوب علی جعفری ۱۲۲۷ھ کندہ ہے اور یہ عبارت بھی الاجوبۃ صحیحۃ والدلائل قویۃ والعمل بہا سنۃ" (یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اصل فارسی متن پر یہ مہریں اور تصویب نہیں ہے) ان اردو ترجموں کے علاوہ ایک سندھی عالم نے اس کا سندھی ترجمہ بھی کیا تھا مگر وہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

---

[1] و [2] مقتدیٰ خاں شروانی۔ مقدمہ تحفۃ المسلمین ص۹ و ص۹۹ شروانی پرنٹنگ پریس علیگڈھ ۱۹۴۳ء مقتدیٰ خاں شروانی نے دوسری طباعت کو پہلی بتایا ہے۔ [3] بشیر الدین قنوجی تفہیم المسائل ص۱۱۔

اِس کتاب کے رَد کی طرف بھی علماء متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے شاہ احمد سعید مجددی دہلوی (۱۲۷۷ھ / سن ۱۸۶۰ء) نے "تحقیق الحق المبین فی اجوبۃ مسائل اربعین" کے نام[1] سے اس کتاب[2] کا جواب لکھا تھا جو ۱۳۱۵ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے اور ۱۳۸۶ھ میں حیدر آباد (پاکستان) سے شائع ہوا۔

اِس کتاب میں ۴۰ میں سے ۱۷ مسائل کو بلا رد و نقد چھوڑ کر باقی ۲۳ مسائل (اور ان کے اذیال) کا رد کیا گیا ہے۔ اس رد میں مؤلف پر تین جگہ مسلک احناف سے انحراف کا ایک جگہ مسلکِ ائمہ اربعہ سے انحراف کا الزام عائد کیا ہے (صفحہ ۶-۷-۱۳)۔ ایک جگہ غلط ترجمہ (ص۶) ایک جگہ غلط حوالہ کا (ص۸) ایک جگہ غلط بیانی کا (ص۱۵) الزام دیا گیا ہے۔ رد میں کہیں شاہ اسحاق کا نام نہیں لیا گیا صرف "مجیب" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

تحقیق الحق المبین کا اردو ترجمہ مولوی بدیع الزماں ساکن بچھرایوں ضلع مراد آباد نے کیا تھا اور خود ہی شائع کیا تھا۔[5]

اِس کتاب اور ان فتاویٰ کی شاہ اسحاق کی طرف نسبت کے سلسلہ میں ہمارے نتائج فکر و مطالعہ حسب ذیل ہیں۔

کتاب کی تالیف کی نسبت تو شاہ صاحب کی طرف قطعاً صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ فتاویٰ اور جوابات شاہ صاحب کے ہوں (جس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے) تو بھی وہ جو صورت ہوتی ہے کہ ایک عالم اور مفتی خود ہی اپنے فتاویٰ کو ترتیب دیتا ہے اُن پر خود ہی مقدمہ لکھتا ہے، خود ہی خاتمہ لکھتا ہے، خود ہی کتاب کا نام تجویز کرتا ہے۔ وہ صورت یہاں سرے سے ہی نہیں ہے۔ کتاب مولوی ابو محمد جالیسری نے ترتیب دی ہے۔ انہوں نے ہی اس کا دیباچہ لکھا ہے۔ انہوں نے ہی اس کا نام تجویز کیا ہے۔ اس لئے زیادہ سے

---

[1] ان تراجم سے استفادہ کے سلسلہ میں ہم پروفیسر ایوب قادری کے ممنون ہیں۔ انہی کے مجموعہ نوادر کتب خانہ سے ہمیں یہ تراجم حاصل ہوئے ہیں اور انہی کے ایک مضمون العلم جولائی ستمبر ۱۹۵۹ء سے بعض تفاصیل حاصل ہوئیں۔ اس سلسلہ میں مولانا رشید احمد گنگوہی جو شاہ احمد سعید کے شاگرد بھی ہیں یہ بیان مستحق توجہ ہے: "یہ بڑے مقدس لوگ تھے جن کا جی چاہے انہیں بدعتی کہے یا وہابی۔ شاہ احمد سعید تو کسی کو رنجیدہ کرنا جانتے ہی نہ تھے جو کسی نے کہا ہاں، سو اگر کسی نے کچھ کہہ کر پیش کیا ہو اور آپ کا نام اس پر درج کرنے کو کہا ہو اور آپ نے ہاں کر لیا ہو پھر تحریر حضرت کے نام سے مشہور کر دی ہو تو عجب نہیں ہے"، تذکرۃ رشید ص۲۳۔ [5] مناقب فخریہ (سرورق ص۲) مطبع احمدی ۱۳۱۶ھ۔

زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شاہ صاحب کے فتاویٰ ہیں جنہیں مولوی سید ابو محمد نے کتابی شکل میں مدوّن کر دیا ہے بالکل اسی طرح جیسے مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار پر پروفیسر محمد سرور کی کتاب کو پروفیسر محمد سرور کی کتاب ہی کہیں گے۔ اور افکار کو۔ اگر پروفیسر سرور کی روایات پر اعتماد ہو۔ مولانا سندھی کے افکار کہیں گے۔ کتاب کو مولانا سندھی کی تالیفات میں محسوب نہیں کریں گے، بلکہ پروفیسر سرور کی تالیفات میں کریں گے۔

رہا ان فتاویٰ کا سوال' تو ہمیں ان کی نسبت کی صحت میں تامل ہے۔

(۱) فتاویٰ کے آخر میں رسم و روایت کے برعکس شاہ صاحب کا نام (دستخط) نہیں ہے۔

(۲) دست خط اور تحریر کی توثیق کے لئے مہر کا بھی رواج عام ہے۔ کتاب کے ایک اردو ترجمہ (تحفۃ المسلمین) کے آخر میں اگرچہ شاہ صاحب کی مہر ثبت ہے مگر ۱۲۶۱ھ کی اشاعت جو ہماری دانست میں اولین اشاعت ہے، مہر سے عاری ہے۔

(۳) کتاب کا اصل مخطوطہ بہت سے شکوک و ظنون کا ازالہ کر سکتا ہے۔ اصولاً یہ مستفتی (محمد زماں خاں) کے پوتے نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے یہاں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر مرحوم نے ایک موقع پر تالیف کتاب کی تاریخ بیان کی ہے لیکن اس کے مخطوطہ کا تذکرہ نہیں کیا حالانکہ مخطوطات و نوادر کے باب میں ان کے ذوق کا تقاضا تھا مخطوطہ محفوظ ہوتا تو ضرور ذکر کرتے پھر انہوں نے اپنے بیان میں دو غلطیاں کی ہیں۔ ایک تو سوالات کی تعداد ۳۵ کے بجائے ۳۶ بتائی ہے۔ دوسرے یہ سوالات مولوی ابو محمد کی معرفت بھیجے جانے کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ خود مولوی ابو محمد کا دیباچہ اس کی تردید کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصل فارسی متن ان کی نظر سے گذرا ہی نہیں۔ ان کے خاندان کی طرف سے ہمیشہ اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہوتا رہا ہے اور مترجم نے اس ترجمہ میں مولف کا دیباچہ حذف کر دیا ہے۔

(۴) مسائل اربعین شاہ صاحب ہی طرف منسوب ایک دوسری کتاب مائۃ مسائل سے دس سال پہلے تالیف کی گئی ہے مگر اس کتاب کے دیباچہ میں مسائل اربعین کا ذکر ہے نہ کسی مسئلہ کے ذکر میں اس کا حوالہ ہے حالانکہ وہ بھی اسی موضوع پر ہے۔

(۵) کتاب کی طباعت شاہ صاحب کے سفر ہجرت (۱۲۵۸ھ) کے دو سال تین ماہ بعد

اور وفات سے ایک سال ۴ ماہ پہلے ہوئی۔ تالیف اور طباعت کے درمیان یہ وقفہ بے سبب اور بے علت نہیں۔

(۶) شاہ صاحب کے سلسلہ کے کئی معتبر اصحاب نے اس کتاب کے انتساب سے انکار کیا ہے۔ محسن ترہتی نے جو شاہ عبدالغنی مجددی شاگرد شاہ اسحاق کے شاگرد تھے۔ مأۃ مسائل اور مسائلِ اربعین دونوں کے شاہ صاحب کی تالیفات ہونے سے انکار کیا ہے اور ان کی تدوین و تالیف کو "رجال سوء" کا فعل قرار دیا ہے[1]

کتاب الاربعین والمأۃ کلاھما نسب الیہ و قع فیہ اشیاء من قبیل الخطاء وغیرہ۔ اخبرنا البعض المشائخ انہ کان فی اصحابہ رجال سوء و کان ھو یحسن الظن بھم فاذا رفعت الیہ مسئلۃ رفعھا الی من حضر منھم فربما یدسون فی جوابھا بعض ما یوافق اھواھم ثم جمعت تلک المسائل و اشتھرت نسبتھا الیہ۔	مسائلِ اربعین و مأۃ مسائل دونوں کتابیں شاہ صاحب کی طرف منسوب ہیں جن میں کئی جگہ غلطیاں ہیں۔ بعض بزرگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ شاہ صاحب کے تلامذہ میں چند بُرے آدمی تھے اور شاہ صاحب ان سے حُسنِ ظن رکھتے تھے چنانچہ آپ کے سامنے جب کوئی مسئلہ (فتویٰ) پیش ہوتا تو آپ انہیں بُرے آدمیوں میں سے جو کوئی حاضر ہوتا (تحریر جواب کے لئے) اس کو دیدیتے۔ یہ لوگ اکثر جوابات میں اپنے پسندیدہ نظریات شامل کر دیتے تھے پھر یہ مسائل کتابی صورت میں (مرتب کر لئے گئے اور شاہ صاحب کی طرف ان کی نسبت مشہور ہو گئی۔

محسن ترہتی نے اپنے مذکورہ بیان میں شاہ صاحب کی جس عادت کا ذکر کیا ہے۔ میاں نذیر حسین کی اس تحریر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔[2]

میاں صاحب بنا بر کارگذاری مستفتیاں و امتحان سوالہا بمن سپردی فرمودند برائے تحریر جوابات۔	میاں صاحب (شاہ اسحاق) میرے امتحان اور فتویٰ پوچھنے والوں کا کام چلانے کے لئے سوال میرے سپرد فرما دیتے تھے کہ جواب لکھ دوں۔

---

[1] الیانع الجنی مدے۔ [2] الحیاۃ بعد المماۃ صہ۵۶۔

معلوم ہی ہے کہ میاں نذیر حسین عدم تقلید اور وہابیت کے متشدد مبلغ تھے مگر دورِ طلبِ علم میں حنفیت کا نقاب زیبِ رُخ تھا۔

محسن ترہتی کے قول کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ مولوی بشیرالدین قنوجی نے بھی تفہیم المسائل کے دیباچہ میں اربعین و ماۃ کو شاہ صاحب کی طرف منسوب کیا ہے

(۷) مندرجہ بالا امکانات کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کتاب کے مولف، مترجم، شارح ایک خاص گروہ کے افراد اور ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل ہیں تو "رجال سور" کا مفہوم متعین ہو جاتا ہے اور ان کی اس بات میں وزن محسوس ہوتا ہے۔ بما کان یدسّون فی جوابھا بعض ما یوافق اھوائھم (یہ بڑے آدمی اکثر فتاویٰ کے جوابات میں اپنے پسندیدہ نظریات شامل کر دیتے تھے) چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مولفِ کتاب، مترجم اور شارح سب کے سب اس نقطۂ نظر کے حامل کی حیثیت سے معروف ہیں۔ جس کو عدم تقلید یا وہابیت کہا جاتا ہے۔

مولفِ کتاب مولوی ابو محمد کو نواب شروانی نے شاہ اسحاق کا شاگرد لکھا ہے۔ مگر نہ تو خود مولوی ابو محمد نے دیباچۂ کتاب میں شاہ صاحب کے نام کے ساتھ استاذی یا استاذنا لکھا، نہ شاہ صاحب کے تلامذہ کی کسی فہرست میں ان کا نام نظر آیا۔ اس لئے اگر صرف نواب شروانی کی شہادت کو ہی کافی تصور کر لیں تو بھی ان کے معتبر و معروف تلامذہ میں سے تو نہیں کہہ سکیں گے اُن کے مسلک اور نظریات پر مترجم کتاب مُلّا محمد نظام شاہجہانپوری نے اس طرح روشنی ڈالی ہے[1]

مولوی محمد امین صاحب (ابو محمد) جو ان جوابوں کے لکھنے والے ہیں وہ بھی سید پاک اور دینِ اسلام کے عقیدے میں چست و چالاک ہیں ساری بدعات سے جو آجکل سادات میں رائج ہیں تائب اور بیزار اور خرافات سے دست بردار ہو کر پاک و صاف مسلمان ہو گئے ہیں اور علم حدیث میں بہت سی مہارت رکھتے ہیں۔

کتاب کے مترجم مُلّا محمد نظام شاہجہانپوری :۔

"کے بعض اساتذہ عامل بالحدیث تھے اور بدعت سے مجتنب۔ یہی عمل مُلّا نظام کا تھا۔

---

[1] تحفۃ المومنین صفحہ

لوگ انہیں "وہابی" کہتے تھے مگر وہ خود کو حنفی بتاتے تھے۔[1]

دوسرے مترجم اور شارح مولوی سعد الدین عثمانی :-

تردیدِ بدعات میں بڑے غالی تھے.... وہ (مولوی فضل رسول بدایونی) مولوی سعد الدین کو اس قدر تنگ کرتے تھے کہ ایک بار اُن کا سقا بھنگی تک بند کر دیا تھا۔ مگر مولوی سعد الدین اس پر بھی اپنی "مساعی" سے باز نہ آئے۔[2]

اسی کے ساتھ اگر آپ یہ بھی شامل کر لیں کہ مسائلِ اربعین کی طرح شاہ صاحب کی طرف دوسری منسوب کتاب مأۃ مسائل کے مرتب مولوی احمد اللہ اناّمی مسلکاً اہلِ حدیث تھے اور اس کتاب کے رد میں جب مولانا فضلِ رسول بدایونی نے تصحیح المسائل لکھی تو مولوی بشیر الدین قنوجی نے اس کا رد تفہیم المسائل کے نام سے لکھا۔ مولوی بشیر الدین بھی مسلکاً اہلِ حدیث تھے۔

اہلِ حدیث حضرات خصوصاً اس دور میں اسی قسم کی تحریفی و الحاقی سرگرمیوں میں ملوث رہے ہیں۔ انہی حضرات نے شاہ ولی اللہ کی طرف کئی رسائل[3] منسوب کر ڈالے۔ انہی نے شاہ اسماعیل کی طرف سے رسالہ تنویر العینین تصنیف کر کے شائع کیا تھا۔[4] شاہ اسحاق بھی ان حضرات کا ہدف بنے رہے اور ان کے قامت پر قبائے وہابیت چُست کرنے کے لئے ان حضرات نے ہر اقدام کیا چنانچہ شاہ اسحاق نے مشکوٰۃ المصابیح کا اردو ترجمہ کیا تو ان حضرات نے اس میں الحاقات و ترمیمات کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ چنانچہ شاہ صاحب کے سب سے معتمد و محبوب و مستقیم شاگرد بلکہ جانشین نواب قطب الدین خاں اس ترجمہ میں الحاقات کے سلسلہ میں اپنے محتاط انداز میں لکھتے ہیں۔[5]

کتاب مشکوٰۃ..... اس کا ترجمہ... حضرت حاجی محمد اسحاق..... نے بیچ زبان ہندی کے بین السطور میں لکھا تھا لیکن کاتبوں سے اس کی صحت میں فرق آنے لگا۔ مرضی جناب موصوف

---

[1]، [2] تحفۃ المسلمین ص۱۱۱ اشاعت ۱۲۷۶ھ۔ [3] دعایا ئے اربعہ پروفیسر محمد ایوب قادری۔

[4] تنبیہ الضا ص۳۰ و نظام الاسلام ص۱۲۳۔ شاہ اسماعیل کی تقویۃ الایمان میں ترمیم تو اس صدی میں بھی کی گئی ہے۔ ہم نے خاندانِ شاہ ولی اللہ کی تالیفات میں تحریفات و ترمیمات پر ایک مستقل مقالہ لکھا ہے۔

[5] مظاہر حق ص۲

کی ایسی پائی کہ اگر بطور شرح کے لکھا جائے تو بہتر ہے اس لئے ہیچمداں نے ترجمہ اس کا عربی (متن) سے علیحدہ کر کے لکھا۔

اس ترجمہ وشرح کا تاریخی نام "مظاہر حق" ہے جس سے ۱۲۵۴ھ برآمد ہوتے ہیں یاد کیجئے کہ اس کے ایک سال بعد ہی ۱۲۵۵ھ میں مسائلِ اربعین تصنیف کی گئی۔ وہ محسن ترہتی جنہوں نے مسائل اربعین اور مأۃ مسائل کے انتساب میں کلام کیا ہے مظاہر حق کے متعلق لکھتے ہیں۔۔۔۔

"وترجمة المشكوٰة له معروفة مرغوب فيها" (آپ کا ترجمہ مشکوٰۃ بھی ہے جو مشہور ہے اور جس میں آپ کے پسندیدہ افکار ہیں)

اِس گروہ کی "الحاق کوشی" کا ایک اور اہم ثبوت یہ ہے کہ اس گروہ کے ایک فرد مولوی احمد اللہ انامی نے ایک کتاب تالیف کی اور شاہ اسحاق کی طرف منسوب کردی (مأۃ مسائل) اور جب مولانا فضل رسول بدایونی نے ان پر تعاقب کیا تو اس میں ترمیم کردی[1] حالاں کہ شاہ صاحب اس وقت وفات پا چکے تھے۔ اگر کتاب درحقیقت شاہ صاحب کی تھی تو اُن کی وفات کے بعد اس میں ترمیم کیسے ہوئی ؟

اس گروہ نے مسائلِ اربعین کے ساتھ کیا معاملہ کیا ؟ اس کا جواب کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے۔

اِس حد تک تو واقعہ ہے کہ محمد زماں خاں نے شاہ صاحب سے استفسار کیا تھا اور شاہ صاحب نے اس کا جواب بھی لکھوایا تھا۔ مگر اس مسئلہ کا کیا جواب لکھوایا تھا اور موجودہ کتاب کس حد تک شاہ صاحب کے اصل جواب سے مطابقت رکھتی ہے ؟ یہ محل اشتباہ میں ہے کیوں کہ یہ جواب جن واسطوں سے ہم تک پہنچا ہے اور جو حضرات اس کی اشاعت میں پیش پیش رہے ہیں ان کی تاریخ الحاق کوشیوں سے سرسبز ہے۔ کتاب کا اصل مخطوطہ سائل (محمد زماں خاں) کے ورثا خصوصًا نواب شروانی کے کتب خانہ میں ہونا چاہیئے تھا مگر اس کا کوئی اعلان ہمارے علم میں نہیں ہے۔ اسی خاندان کی طرف سے کتاب کے اصل فارسی متن کے بجائے ہمیشہ اس کا اردو ترجمہ شائع ہوتا رہا۔ ۱۳۷۸ھ میں اس کا

---

[1] فیوض ارواح قدسی ص۱

تازہ ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ اس کے مقدمہ میں ناشر نے تاریخ تالیف، اشاعتوں، ترجموں، شرح، مترجمین، شارح، ناشر، غرض ہر گوشہ کے متعلق تفاصیل ہیں۔ مگر نہیں ہیں تو مخطوطہ کے متعلق۔ ہم عدم ذکر کو مستلزم عدم نہیں کہتے مگر اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ اس کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس صورت میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا کیا اضافات ہیں جو اس میں کئے گئے پھر بھی جن الحاقات و اضافات کا سراغ مل سکا ہے ان سے ہمارے اس گمان ہی کی تصدیق ہوتی ہے کہ شاہ صاحب کا اصل جواب ترمیم والحاق کا ہدف رہا ہے۔

(۱) سوال ۳۲ یہ تھا کہ نومولود کے ماں باپ کو جب نائی مبارک باد دیتا ہے تو اس کے جواب میں نائی کو انعام دینے کا جو دستور ہے وہ کیسا ہے؟ اس کے جواب کا خلاصہ اور ترجمہ یہ ہے کہ انعام دینا جائز ہے مگر نائی کا اصرار کرنا اور دستور بنا لینا جائز نہیں ہے۔ اس پہ پہلے مترجم مولوی سعد الدین عثمانی نے یہ اضافہ کیا ہے [1] اور جو یہ لوگ اکثر حجام وغیرہ ہری گھانس کا پونڈا دے کر مبارک باد دیتے ہیں یہ رسم ہندوستان کے کفار کی ہے۔ پس اس طرح خوش خبری اور مبارک بادی پہنچانا اور اس کے عوض میں کوئی چیز بطور انعام اُن کو دینا درست نہیں۔ چاہیئے کہ ایسے وقت میں حجام وغیرہ کو توبیخ و زجر کریں نہ کہ انعام و اجر دیں۔

(۲) سوال ۳۳ کے جواب کے ترجمہ میں مترجم نے اپنی طرف ایک اور شرط بھی بڑھا دی۔

"اور قرض بھی نہ لینا پڑے۔" [2]

(۳) مولوی سعد الدین نے ترجمہ کے ساتھ شرح بھی کی ہے۔ ترجمہ کے بعد تائید، تنبیہ، تفصیل وغیرہ عنوانات سے جو شرح کی ہے اس میں متعدد جگہ متن کے خلاف گئے ہیں۔۔ مثلاً اسی جواب میں متن میں بھات کی رسم کو جائز بلکہ مستحب لکھا گیا ہے۔ مگر شارح لکھتے ہیں [3] فی الحقیقۃ اصل اس رسم کی مشرکینِ ہند کے یہاں سے ہے۔ کتاب کے دوسرے ترجمہ تحفۃ المسلمین میں حسب ذیل مقامات پر متن میں ترمیم والحاق یا فتاوائے متن سے اختلاف کیا گیا ہے۔

---

[1] افادۃ المسلمین ص۲۹ یہ اضافہ بغیر امتیاز کے اس طرح کیا گیا ہے کہ اصل متن سے ناواقف قاری اس کو متن ہی کا ترجمہ سمجھنے پر مجبور رہو ئے۔ [2] و [3] افادۃ المسلمین ص۳۰۔

(۱) سوال ۳۳ جواب میں جو اضافہ صاحب افادۃ المسلمین نے کیا تھا وہی اضافہ الفاظ کے تغیر یسیر کے ساتھ صاحب تحفہ نے بھی کیا ہے۔

"اور جو اس وقت کوئی گھاس وغیرہ سر سبز چیز ہے لاکر مبارک دے جیسا کہ کفار ہند کی رسم ہے تو اس صورت میں اس کو تنبیہ و زجر چاہئے نہ انعام و اجر"[1]

(۲) سوال ۵ کا ایک جز تھا کہ عقیقہ کا گوشت کس طرح تقسیم کریں؟ اس کے جواب کا ایک جزیہ تھا کہ عقیقہ کا حکم قربانی کا سا ہے۔ اس لئے ماں باپ، دادا، دادی یہ گوشت کھا سکتے ہیں اس پر مترجم نے ایک حاشیہ لکھا ہے۔[2]

"لیکن خاتم المحدثین (؟) نے حدیث "کل غلام مرهون بعقيقته" سے نکالا ہے کہ اس حدیث میں رہن کی لفظ گرو کے معنی پر ہے۔ فدیہ دینے پر دلالت کرتی ہے اس واسطے ماں باپ کو کہ اس کی طرف سے فدیہ کرتے ہیں، کھانا مکروہ ہے۔۔۔

(۳) سوال ۳۹ کے جواب کے ترجمہ میں خزانۃ الفقہ اور کفایہ کی دو عربی عبارتیں اور ان کا اردو ترجمہ بڑھا دیا ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر عورت اپنے گھر سے نکلے اور اس کا شوہر اسے منع نہ کرے تو چاہے وہ شوہر عالم و قاری ہی کیوں نہ ہو دیوث ہے اور اگر عورت بغیر اجازت شوہر گھر سے باہر چلی جاوے مرد کی ذمہ سے مہر ساقط ہو جاتا ہے۔

(۴) خاتمہ میں "کتاب ابن ابی الدنیا" کے حوالہ سے ایک حدیث اور اس کے ترجمہ کا اضافہ کر دیا ہے۔ (یہی اضافہ افادۃ المسلمین میں بھی ہے)

مأۃ المسائل

پورا نام مأۃ المسائل فی تحصیل الفضائل بالادلۃ الشرعیہ و ترک الامور المهنیۃ"

جامع و مرتب۔ احمد اللہ بن دلیل اللہ صدیقی اناوی

---

[1] تحفۃ المسلمین صہ ۱۹ دونوں ترجموں (افادۃ المسلمین اور تحفۃ المسلمین) میں یہ اضافہ اس کی نشان دہی کرتا ہے کہ ان دونوں ترجموں کے سامنے جو نسخہ متن فارسی تھا اس میں ایسی کوئی عبارت تھی جس کا دونوں نے ترجمہ کیا ہے حالانکہ ہمارے سامنے ۱۳۶۱ھ کا جو ایڈیشن ہے اس میں ایسی کوئی عبارت نہیں ہے۔ [2] تحفۃ المسلمین صہ ۲۱/۲۲۔

سن تالیف۔ ۱۲۴۵ھ سنِ طباعت معلوم نہ ہو سکا ہے۔ میرے پیشِ نظر جو نسخہ ہے، وہ اشاعتِ پنجم (۱۹۱۳ء) مطبوعہ نول کشور کانپور ہے۔ مولانا فضل رسول بدایونی نے اس کتاب کا جو رد تصحیح المسائل کے نام سے لکھا تھا اس کا سن تالیف ۱۲۶۶ھ ہے۔ اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ماۃ مسائل کم از کم ۱۲۶۶ھ سے پہلے طبع ہو گئی تھی۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔

مولف[1] مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ ایک تیموری[2] شہزادے نے نوّے[3] سوالات لکھ کر پیش کئے اور جواب پر مصر ہو گئے۔ مجبوراً شاہ صاحب نے ان کے جوابات لکھے۔ میں نے مزید دس سوالات اور شاہ صاحب کے جوابات اضافہ کر کے ماۃ مسائل نام رکھا۔ —

کتاب میں پہلے شہزادے کے نوّے سوالات کے جوابات ہیں پھر ایک "فائدہ دربیان حقیقتِ کبیرہ صغیرہ" ہے پھر خاتمہ دربیان سوالات عشرہ اور ان کے جوابات ہیں جن میں سے چھ سوالوں کے جواب میں لکھا ہے کہ یہی سوالات عہد سلطان قطب الدین میں حضرت نظام المشائخ نظام الدینؒ کے روبرو اس وقت کے علماء دہلی سے لئے گئے تھے اس لئے جواب جدید کی حاجت نہیں بلکہ مولوی عصمت اللہ بن اعظم ساکن سہارنپور کے رسالہ سے بقیہ عبارت محضر نقل کی جاتی ہے اس کے بعد محضر کی عبارت بتمامہا نقل کر دی ہے۔

اس کتاب کے جواب میں مولانا فضل رسول بدایونی نے تصحیح المسائل لکھی تھی جو اُن کے کے بھانجے مولوی فیض احمد بدایونی نے ۱۲۶۶ھ میں مرتب کر کے شائع کی۔ تصحیح کے جواب میں مولوی بشیر الدین قنوجی نے تفہیم المسائل لکھی۔ تفہیم کا جواب مولوی فیض احمد بدایونی نے تعلیم الجاہل کے نام سے دیا۔ جس کا جواب مولانا قنوجی نے افہام الغافل کے نام سے لکھا۔

ہمیں شاہ صاحب کی طرف اس کتاب کی نسبت سے بھی اتفاق نہیں ہے۔ عدم اتفاق کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

---

[1] مولوی احمد اللہ بن دلیل اللہ صدیقی، ولادت ۱۲۳۴ھ۔ مولوی عبد الجلیل علی گڑھی اور شاہ محمد اسحاق سے تحصیلِ علوم کی فراغت کے بعد دہلی میں مقیم ہو گئے پھر مراد آباد منتقل ہو گئے اور وہاں عرصہ تک درس دیا۔ آخر میں قاضی ہو کر بھوپال چلے گئے تھے۔ تالیفات میں تفہیم المسائل کے علاوہ صواعق الٰہیہ در رد (مولانا فضلِ رسول بدایونی) اور غایۃ الکلام ہیں۔

[2] "مرزا غلام حیدر وغیرہ" مقالاتِ طریقت ص۲۳۵ یہ شہزادے جامع مسجد کے تاریخی مناظرے میں بھی شریک تھے اور شاہ اسماعیل کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ سیف الجبار (مولانا بدایونی) ص۲۵

(۱) اِس کتاب کو بھی شاہ صاحب کی مرتبہ نہیں بتایا جاتا بلکہ ان کے ایک شاگرد مولوی احمد اللہ انامی خود کو اس کا مرتب بتلاتے ہیں۔ انہوں نے دیباچہ لکھا ہے اور مولوی عبدالحی نے انہی کی مولفات میں اس کو شامل کیا ہے۔ (نزہۃ الخواطر الجزء السابع ص۴۸)

(۲) کتاب ۱۲۴۵ھ میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کی اشاعت بہت بعد میں ہوئی۔ غالباً شاہ صاحب کی وفات کے بعد (۱۲۶۲ھ) ہوئی۔

(۳) مولانا فضل رسول بدایونی نے ثابت کیا ہے کہ اُن کی کتاب تصحیح المسائل (رد ماۃ مسائل) کی اشاعت کے بعد (۱۲۶۶ھ) مِأۃ کا جو ایڈیشن شائع ہوا اس میں کئی جگہ تغیّر و تبدّل ہوا ہے۔ (ص۱۷ فیض ارواحِ قدسی) حالانکہ اس وقت شاہ صاحب وفات پا چکے تھے۔

(۴) مولوی بشیر الدین قنوجی نے جو شاہ صاحب کے شاگرد تھے اور جنہوں نے مولانا فضل رسول بدایونی کی تصحیح المسائل کا رد (تفہیم المسائل) لکھا تھا انہوں نے بھی اس کو شاہ صاحب کی تالیف لکھنے کے بجائے شاہ صاحب کی طرف "منسوب" لکھا ہے۔ (مقدمہ تفہیم المسائل)

(۵) مولوی محسن ترہتی نے اربعین کی طرح اس کتاب کو بھی شاہ صاحب کی طرف نسبت میں کلام کیا ہے۔ ان کی پوری عبارت یہ ہے۔

کتاب الاربعین والمأۃ کلاهما ینسب الیه وقع فیه اشیاء من قبیل الخطا وغیرہ اخبرنا بعض المشائخ انہ کان فی اصحابہ رجال سوء وکان هو یحسن الظن بهم فاذا رفعت الیه مسئلۃ رفعها الی من حضر منهم فربما کانوا یدسون فی جوابها بعض ما یوافق اهواءهم ثم جمعت تلك المسائل واشتهرت نسبتها الیه وفیه امور تعقبها فضل الرسول الاموی البدایونی واللہ اعلم۔ الیانع الجنی

کتاب الاربعین و ماۃ یہ دونوں کتابیں شاہ صاحب کی طرف منسوب ہیں جن میں کئی مسائل میں غلطیاں وغیرہ ہیں۔ ہم نے بعض بزرگوں نے فرمایا کہ شاہ صاحب کے تلامذہ میں بعض بُرے لوگ تھے اور شاہ صاحب ان سے حسنِ ظن رکھتے تھے۔ چنانچہ جب آپ کے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو (تحریر جواب کے لئے) اس کو ان لوگوں کو دے دیتے تھے۔ یہ لوگ اکثر جواب میں اپنے پسندیدہ نظریات شامل کر دیتے تھے۔ پھر یہی مسائل جمع کر لئے گئے اور شاہ صاحب کی ان کی

نسبت مشہور ہو گئی اور ان میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کا مولانا فضل رسول بدایونی نے رد کیا ہے۔

جہاں تک مولوی محسن ترہتی کے اس قول کا تعلق ہے کہ شاہ صاحب سے جو مسائل دریافت کئے جاتے تھے وہ اپنے شاگردوں کے سپرد کر دیتے تھے۔ میاں نذیر حسین کی ایک تحریر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے جو اگرچہ بعد میں جماعتِ وہابیہ کے میر کارواں بنے لیکن اس وقت غالی حنفی خود کو ظاہر کرتے تھے۔

دریں ازمنہ مذکورہ صدہا فتاویٰ اتفاق تحریر رو داده و خود مولانا مرحوم بنا بر امتحان و کارگذاری مستفتیاں سوالہا بمن سپرد می فرمودند برائے تحریر جوابات

الحیاۃ بعد الممات۔ ص۵۶ و ۵۷

اس زمانہ (طلب علمی) میں سینکڑوں فتاویٰ لکھنے کا اتفاق ہوا اور خود مولانا مرحوم میرے امتحان اور فتویٰ پوچھنے والوں کا کام نکالنے کے لئے آئے ہوئے سوالات، جوابات لکھنے کے لئے میرے سپرد فرماتے تھے۔

(۶) اربعین بھی شاہ صاحب کی تالیف بتائی جاتی ہے اور مأۃ بھی۔ مگر اربعین و مأۃ کے جوابات میں متعدد مقامات پر اختلافات بلکہ تضادات ہیں۔ مولانا بدایونی نے تصحیح المسائل کے صفحہ ۳۴۔ ۳۶۔ ۲۲۱۔ ۲۷۵۔ ۲۷۹۔ ۲۹۷ پر اس قسم کے متعدد تضادات کی نشان دہی کی ہے۔ مثلاً مأۃ میں سوال ۲۲ کے جواب میں استمداد از قبور کو جائز لکھا ہے۔ اور اربعین میں سوال ۴۰ کے جواب میں اسی کو ناجائز بتایا ہے۔ (تصحیح المسائل صفحہ ۲۷۵، ۲۷۹) اس طرح تعین یوم عرس کو اربعین (سوال ۳۶) میں ناجائز اور مأۃ میں (سوال ۲۲) جائز لکھا ہے۔ (تصحیح المسائل ص۳۶) یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں مأۃ بقول مؤلف ۱۲۴۵ھ میں ترتیب دی گئی ہے یعنی اربعین سے دس سال قبل۔ مگر اس کے باوجود اربعین کے نہ تو دیباچہ میں مأۃ کا ذکر ہے نہ کسی مسئلہ کے ذکر میں اس کا حوالہ ہے۔ نہ اجمال کی تفصیل کے لئے حوالہ دیا ہے۔

(۷) مأۃ کو مولوی عبدالحی نے نزہۃ الخواطر الجزء السابع ص۴۲ پر مولوی احمد اللہ کی تالیفات میں شمار کیا ہے۔

اُردو ترجمہ مشکوٰۃ المصابیح

یہ وہ ترجمہ ہے جو اپنے تاریخی نام "مظاہر حق" سے معروف و متداول اور نواب قطب الدین خاں دہلوی کی طرف منسوب[1] ہے مگر وہ درحقیقت شاہ اسحاق کا کیا ہوا ہے۔ جیسا کہ خود نواب صاحب نے تحریر کیا ہے[2]

"کتاب مشکوٰۃ شریف..... اس کا اردو ترجمہ عدیم النظیر..... حضرت حاجی محمد اسحاق..... نے بیچ زبان ہندی کے بین السطور میں لکھا تھا لیکن کاتبوں سے اس کی صحت میں فرق آنے لگا۔ مرضی جناب موصوف کی ایسی پائی کہ اگر یہ بطور شرح کے لکھا جائے تو بہتر ہے اس لئے اس ہیچمدان نے ترجمہ اس کا عبارت عربی سے علیحدہ کر کے لکھا اور فائدے مختصر مناسب مقام کے..... زیادہ کر کے خدمتِ عالی میں عرض کی اور جناب ممدوح نے بھی کچھ فائدے لکھے تھے تبرکاً اس میں درج کئے۔

نواب صاحب نے اس شرح و ترجمہ کا نام مظاہر حق رکھا جس سے ۱۲۵۲ھ کے اعداد نکلتے ہیں۔ (۱۸۳۸ء) مگر جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے شاہ صاحب نے یہ ترجمہ اس سن سے پہلے تحریر فرمایا تھا جو طبع نہیں ہوا تھا اور طلبہ اس کی نقلیں کر لیتے تھے اور نقل کرتے وقت اپنے اپنے مسلک کے پیشِ نظر اس ترجمہ میں ترمیم بھی کر لیتے تھے۔ شاہ صاحب نے اس ترمیم و تغیر کے سدِباب کے لئے یہ تجویز کی کہ ترجمہ کے ساتھ تشریح بھی کی جائے تاکہ ترجمہ میں ترمیم کا راز یہ شرح فاش کر دے۔ چنانچہ نواب صاحب نے استاذ گرامی کی تعمیلِ ارشاد میں استاد کے ترجمہ کے ساتھ اپنی شرح بھی لکھی اور اس مجموعہ کی تاریخ تالیف و تحریر مظاہر حق سے نکالی۔ اس تفصیل کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے مشکوٰۃ کا اردو ترجمہ ۱۲۵۲ھ سے چند سال پہلے کیا تھا۔

نواب صاحب، شاہ صاحب کے محبوب و معتمد شاگرد شاہ صاحب کے فقہی مسلک کے متبع اور ہجرت کے بعد شاہ صاحب، کے حقیقی جانشین تھے، اِس لئے وہ جس ترجمہ کو شاہ صاحب

---

[1] چنانچہ ہمارے پیشِ نظر جو اشاعت ہے اس پر بھی مترجمہ مولوی محمد قطب الدین خاں صاحب شاہجہانپوری ..... تحریر ہے مطبع منشی نول کشور ۱۹۲۰ء طبع پنجم۔ [2] مظاہر حق ص۳

کی طرف منسوب کر رہے ہیں، وہ درحقیقت شاہ صاحب ہی کا ہو گا اور اس انتساب کی نوعیت، مسائلِ اربعین اور مأتہ مسائل کے انتساب کی سی قطعًا نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ نواب صاحب کے علاوہ دوسرے حضرات نے بھی شاہ صاحب کی تالیفات میں اس کو محسوب کیا ہے۔ مثلاً محسن ترہتی جو شاہ صاحب کے شاگرد و شاہ عبدالغنی مجددی کے شاگرد تھے لکھتے ہیں:۔

ترجمۃ المشکوٰۃ لہٗ معروفۃ مرغوب فیہا۔ (الیانع الجنی ص۶۲)

"تذکرہ علماء ہند اور الحیاۃ بعد المماۃ میں شاہ صاحب کی ایک اور تالیف "اقتدار ہندی" کا نام بھی لیا ہے مگر نہ صرف یہ کہ ہم اس کتاب کے وجود سے لاعلم ہیں بلکہ ان دونوں کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب میں یہ نام بھی نظر سے نہیں گزرا۔"

غلام رسول مہر اور یحییٰ خاں نوشہروی نے ایک کتاب "تذکرۃ الصیام" کو بھی شاہ صاحب کی تالیفات میں شمار کیا ہے۔ مگر نہ یہ کتاب کہیں پائی جاتی ہے نہ ان دونوں حضرات نے اپنے کسی ماخذ کا حوالہ دیا ہے اس لئے یہ بات بھی نامعتبر ہے۔

فضائلِ عشرۂ ذی الحجہ

نواب قطب الدین خاں اپنی کتاب احکام العیدین کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

(جب شاہ محمد اسحاق نے ہجرت فرمائی) "تو اس ہیچ مداں کو خیال ہوا کہ آپ کی تالیفات میں سے کوئی رسالہ ہاتھ لگے تو اس کا ترجمہ اور شرح زبان ہندی میں لکھوں تاکہ کچھ نمونہ فیض صحبت آپ کی کا لوگوں میں باقی رہے۔ پس ایک رسالہ فضائل عشرہ ذی الحجہ میں اس میں حدیثیں صحیحہ جمع کی تھیں، پایا۔ میں نے اس کا ترجمہ اور شرح مختصر لکھی کہ مشتمل ہے احکام قربانی اور نماز عیدین وغیر ذٰلک کو۔" ص۲

کتاب کے خاتمہ کی عبارت ہے۔

تمام شد رسالۂ احکام العیدین من تصنیف مولوی محمد قطب الدین خاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ شرح رسالہ فضائل ذی الحجہ من تصنیف قدوۃ العلماء والکاملین زبدۃ العلماء والعارفین مولانا حضرت محمد اسحاق صاحب زاد اللہ شرفًا[۵۱] ص۵۲

---

[۵۱] اسی نام کی ایک کتاب نواب قطب الدین خاں کی بھی ہے مگر وہ ہمیں دستیاب نہیں ہوئی ممکن ہے اس کے مطالعہ سے کوئی سراغ ملے۔

کتاب کا سالِ تالیف ۱۲۵۸ھ ہے (یعنی جس سال شاہ صاحب نے ہجرت فرمائی) اور اس کا تکملہ ۱۲۶۱ھ میں لکھا گیا۔ (ص ۵۳)

شعب الایمان

اب ہم شاہ صاحب کی ایک ایسی تالیف کا تعارف کراتے ہیں جس کا کسی تذکرہ نگار نے نام نہیں لیا۔ لیکن ہمارے سامنے جو اس کا مخطوطہ ہے وہ ۱۲۶۹ھ کا مکتوبہ ہے اور شاہ صاحب سے قریب العہد ہے یعنی شاہ صاحب کی وفات ۱۲۶۲ھ کے صرف ۶ سال بعد کا لکھا ہوا ہے۔ ناسخ و ناقل، سید احمد شہید کے خانوادے کے ایک فرد سید محمد صدیق بن سید محمد عمر حسنی نصیر آبادی (رائے بریلوی) ہیں اور جس مجموعہ میں ہے اس کے باقی مخطوطات تقابل کے بعد حرف بحرف صحیح و مستند ثابت ہوئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رسالہ شعب الایمان

از حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکی

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد والہ واصحابہ اجمعین۔ اما بعد باید دانست کہ انسان مکلف را ضرور است کہ اوامر حق تعالیٰ را بجا آرد و از مناہی اجتناب نماید۔ اوامر بسیار است و نواہی ہم بسیار است پس ایں قدر ضرور است کہ شعبۂ ایمان معلوم نماید تا موافق آں اعتقاد و عمل خود درست نماید و مناہی را ہم معلوم نماید کہ کدام کدام است تا کہ از ان احتراز سازد و مناہی دو قسمہ است یکے گناہ صغیرہ کہ دوم گناہ کبیرہ۔ صغیرہ آنست کہ ہیچ از ان در شرع آمدہ باشد یا خلاف مشروع شود یا طریقہ کہ مامور باشد در دین آں مرتفع شود و ہر گناہ صغیرہ اصرار نماید اگر بسبب جلبت بشری مرتکب گناہ شد توبہ نماید اگر اتفاق توبہ نشد پس امید از جناب باری تعالیٰ آنست کہ بسبب طاعات و ضو و نماز و روزہ آنہا را دور سازد، دوم گناہ کبیرہ و گناہ کبیرہ را نیز معلوم نماید کہ کدام اند تا از آنہا۔ احتراز شدید سازد کہ از اکثر طاعتہا دور می شوند پس اول تفسیر گناہ کبیرہ باید دانست بعد از تعداد گناہاں در ملاحظہ خود محفوظ باید داشت۔

گناہِ کبیرہ گناہے است کہ براں وعید باتش و عذابِ سخت در قرآن شریف یا در حدیثِ صحیح آمدہ باشد یا مرتکب آں را تسمیہ.... کردہ باشند چنانچہ در حدیث شریف آمدہ است من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر وارد شدہ یا بر مرتکب آں حد مشروع باشد مثل زنا و دزدی و سرقہ و قزاقی و شرب خمر با شریتِ او ساری یا زیادہ ازیں گناہ مسطورین باشد بس تعداد گناہاں کبیرہ انست کہ ہفدہ در حدیث شریف وارد شدہ اند بیان گناہاں کبیرہ بایں وضع کہ چہار گناہ در دل است یکے شرک باللہ و شرک باللہ انواع است یکے در وجوب ذات دوم در عبادت سوم در استعانت چہارم در علم پنجم در قدرت ششم در تصرف ہفتم در خلق ہشتم در ندا نہم در قول دہم در تسمیہ یازدہم در حج دوازدہم در نذر سیزدہم در تفویض امور خلائق دوم نیت اصرار بر معصیت سوم ناامیدی از رحمتِ خدا۔ چہارم امن از مکر خدا و چہار گناہ بر زبان است یکے شہادت دروغ دوم قذف مردِ عفیف یا زنِ عفیفہ بزنا سوم قسم دروغ چہارم سحر و سہ گناہ در شکم ست یکے آشامیدن شراب دوم خوردن مال یتیم سوم خوردن مال سود و دو گناہ در ورغ است یکے زنا دوم لواطت و دو در دست است یکے کشتن ناحق دوم دزدی کردن و یک در پاست گریختن از کفار روز جنگ و یک گناہ شامل جمیع بدن ست و آں حقوقِ والدین و سوائے اینہا دیگر کبیرہ شمار کردہ اند و آنہا است۔ تصدیق کردن کاہن و تکذیب کردن رسول را و قرآن را فرشتہ ہا را و انکار کردن اینہا و استہزا مردن بیانہا و انکار کردن ضروریات دین را و ترک کردن نماز و زکوٰۃ روزہ و حج و تقدیم کردن نماز بر وقت و تاخیر کردن نماز از وقت خود بلا عذر و جنگ کردن از مسلمانان بناحق و دروغ بستن بر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم و سب کردن صحابہ و کتمان شہادت بلا عذر و گرفتن رشوت و انداختن فساد درمیان مرد و زن و سعایت کردن پیش سلطان و گرفتن مال پیش بطریق غصب بقدر دینار و افطار کردن روزہ رمضان در روز بلا عذر و قطع کردن رحم یعنی قرابت و خیانت کردن در کیل و وزن و ترک کردن امر بمعروف و نہی عن المنکر و احراق نمودن حیوان باتش و نافرمانی کردن زن شوہر خود را بلا سبب و اہانت اہل علم و خوردن گوشت خوک و نوشیدن مسکر و نکاح محارم خود و قمار و ترک کردن ہجرت از ملک کفار و دوستی کردن کفار و بد گفتن

والدین وترک کردن جہاد باوجود قدرت وغلبۂ کفار واما شعبۂ ایمان کہ بجا آوردن آنہا فرداست یا مستحب پس اینست ایمان آوردن بخدا وصفات او متصف بجمیع صفات کمال از حیات وعلم وقدرت واراده وسمع وبصر وکلام اعتقاد نمودن ونیز اعتقاد تنزیہ جمیع علامات نقص وزوال نمودن وماسوائے او را حادث دانستن وایمان بملائکہ وکتابہائے او ورسول او آوردن ونیز ایماں بتقدیر او خیر باشد یا شر آوردن ونیز ایمان بروز آخرت ونار وحشر وحساب ورویت دیدار وعذاب قبر وغیر آں آوردن ومحبت خدا داشتن ودوستی وبغض در دل او داشتن ومحبت بپیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم داشتن واعتقاد وتعظیم او نمودن ودر تعظیم او فرستادن درود بر پیغمبر داخل ست ومحبت صحابہ واہل بیت واتباع سنّت ایں ہمہ در محبت نبی داخل ست وعمل باخلاص نمودن در دین داخل ست ترک ریا وترک نفاق ونیز شعبۂ ایمان است خوف خدا او امید بخدا وتوبہ کردن وشکر گزاردن ووفا بعہد ونذور بجا آوردن وصبر وبجا آوردن طاعت و اجتناب از معصیت کردن ورضا بقضا نمودن وجہاد کردن وتوکل کردن وشفقت کردن نمودن وتوقیر بزرگان ورحمت برخوردان داخل در تواضع است وترک کردن کبر وعجب وحسد وحقد یعنی کینہ وترک کردن غضب وجاری کردن زبان بر کلمۂ توحید وتلاوت نمودن قرآن مجید وتعلیم علم وتعلیم کردن علم ودعا خواستن از حق تعالیٰ وذکر نمودن باری تعالیٰ واستغفار نمودن واجتناب از لغویات کردن وپاک شدن از نجاست حسی وحکمی وپوشیدہ ستر عورت خود را وبجا آوردن نماز فرض باشد یا نفل وروزہ داشتن واعتکاف نمودن وتلاش نمودن شب قدر در عشرۂ اخیرہ رمضان وزکوٰۃ دادن وصدقۂ عید الفطر دادن وحج کردن وعمرہ نمودن وطواف گرد خانۂ کعبہ گزاردن وذبح قربانی وہدی کردن وگریختن از فتنہ برائے حفاظت دین خود وہجرت نمودن از ملک کفار بسوئے دار الاسلام وادا ساختن کفارات وقصد کردن در ایمان خود یعنی قسمہا خود را در عفت داشتن بکردن نکاح وخبر گیری کردن بحقوق عیال خود وبر کردن بوالدین خود وتربیت کردن اولاد خود وصلہ کردن رحم خود اطاعت مالکان ونرمی کردن بغلامان وکنیزکاں وریاست کردن بعدل ومتابعت جماعت نمودن واطاعت اولی الامر

نمودن بشرطیکہ مخالف شرع نباشد و اصلاح کردن درمیان مردماں و قتال کردن بخوارج و باغیاں واعانت نمودن بر میرے و در دین داخل است امر بمعروف و نہی عن المنکر و اقامت کردن درو واداکردن امانات و دادن خمس و اکرام و تعظیم مہمان نمودن و مشتاختن ہمسایہ و حسنِ معاملہ نمودن درمیان مردماں و جمع کردن مال بکسب حلال و خرچ کردن مال در حق آں یعنی یتیماں و مستحقان دادن و برائے عمارت مسجد و مدارس و خانقاہاں و سراہا و پلہا و غیر آں۔

صرف نمودن و ترکِ اسراف و تبذیر نمودن و باہم مسلماناں افشار سلام نمودن واطعام طعام کردن و جواب سلام دادن و جواب سلام دادن و اجابت دعوت نمودن بشرطیکہ قدرت داشتہ باشد و در آنجاں امر مخالف شرع نباشد و نماز برجنازہ خواندن مشایعت آں نمودن و عیادتِ مریضاں کردن و در ہر ماہ سہ روزہ داشتن و مردماں راضرر نہ رسانیدن واجتناب از لہو کردن و حیا نمودن و چیز موذی را از راہ دور کردن۔ آخر دعونا الحمد للہ رب العالمین۔ اولاً و آخراً و ظاہراً و باطناً صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔ تمت تمام شد کار من نظام شد۔

الحمد للہ والمنہ کہ نسخۂ شعب الایمان تصنیف مولانا و بالفضل اولانا مولانا محمد اسحاق صاحب مغفور و مرحوم بخط بے ربط خاکسار محمد صدیق ابن سید محمد عمر ساکن قصبہ نصیر آباد غفراللہ ذنوبہٗ بتاریخ دوم۔ ماہ ربیع الاول۔

مزاج وکردار ــــ مسلک وافکار

شاہ محمد اسحاق دہلوی مختلف اعتبارات سے ایک عظیم وجلیل شخصیت تھے۔ شاہ عبدالعزیز جیسے محدثِ جلیل کے نواسے اور خلیفہ، مدرسہ رحیمیہ کے صدر نشین اور صدہا خدام حدیث کے شیخ۔ یہ بھی آپ کی عظمت ہی کا پہلو ہے کہ مظلومیت میں بھی کسی سے کمتر نہیں تھے۔ مختلف حلقوں نے آپ کے ساتھ بے تکلف ناانصافی روا رکھی اور اس کے نتیجے میں آپ کا مسلک غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کے غبار میں دھندلا گیا۔

جماعت مجاہدین کے تذکرہ نگاروں نے آپ کو نظر انداز کرنے کی متواتر و منظم کوشش کی۔

اہلِ حدیث اور وہابیوں نے اپنے متشددانہ مسلک کو آپ پر مسلط کرنے کی مہم چلائی۔
بدایونی علماء نے وہابیوں کی غلط بیانیوں کو صحیح تسلیم کر کے آپ کو بھی وہابیوں میں شامل کر لیا۔
اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے:۔

جماعتِ مجاہدین کے تذکرہ نگاروں نے سید صاحب اور شاہ اسماعیل کے جوشِ عقیدت میں صرف شاہ اسحاق نہیں بلکہ ان کے پورے خاندان اور اُن کے سارے بزرگوں کے ساتھ بڑا ہی ناروا اور گستاخانہ معاملہ کیا اور ان قابلِ احترام بزرگوں کو بدنام کرنے اور مشتبہ قرار دینے اور اُن کی طرف اپنی تحریروں اور کتابوں کی نسبت کرنے کی مہم چلائی۔ شاہ ولی اللہ کی طرف ایک دو نہیں چار رسائل منسوب کئے اور انہیں بکثرت شائع کرتے رہے۔ شاہ عبدالعزیز جو سید صاحب کے مرشد تھے انہیں سید صاحب ہی سے بیعت کا آرزومند و مشتاق بتایا[1] انہیں شاہ عبدالعزیز سے برتر قرار دیا[2] شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی اور شاہ اسماعیل کے والد شاہ عبدالغنی کو سید صاحب کے مریدوں میں محسوب کیا[3] حالانکہ وہ سید صاحب کی ولادت (۱۲۰۰ھ) کے صرف تین سال بعد (۱۲۰۳ھ) میں وفات پا گئے۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو لوگ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالغنی کیساتھ یہ گستاخیاں روا رکھتے ہوں شاہ اسحاق ان کے یہاں کس شمار میں ہوں گے؟ چنانچہ پہلی کوشش تو یہ کی گئی کہ ان کا نام نشان ہی مٹا دیا جائے اور ایک مستقل ہستی کے طور پر ان کا تذکرہ ہی نہ کیا جائے۔ چنانچہ سید محمد علی رائے بریلوی کی مخزنِ احمدی، مولوی جعفر علی نقوی کی منظورۃ السعداء، مرزا حیرت کی حیاتِ طیبہ، منشی محمد جعفر تھانیسری کی سوانح احمدی، مولانا ابوالحسن علی کی سیرت احمد شہید، کسی میں بھی شاہ اسحاق کے لئے مستقلاً کوئی باب، کوئی فصل قائم نہیں کی گئی۔ مولانا غلام رسول مہر نے تین ضخیم مجلدات میں تحریکِ مجاہدین کی تاریخ مرتب کی اور ان میں تحریک کے معمولی رفقا تک کا مفصل تذکرہ مستقل ابواب میں کیا لیکن شاہ اسحاق کو بھول گئے۔ جماعتِ مجاہدین کے اختتام پر ایک ضمیمہ میں شاہ اسحاق اور ان کے بھائی شاہ یعقوب کا ایک جا تذکرہ

---

[1] حیات سید احمد شہید (سوانح احمدی) از محمد جعفر تھانیسری طبع کراچی ص۱۲۱
[2] دہلی اور اس کے اطراف ص۱۳۵۔ [3] حیات سید احمد شہید صفحہ ۱۵۵، ۲۹۵۔

کیا اور وہ بھی کل چار صفحات ہیں۔ یہ چار صفحات کا ضمیمہ بھی اس لئے نصیب ہوا کہ یہ دونوں بھائی "سید صاحب کے ارادت مند" تھے۔

مولانا مہر نے تو صرف "ارادت مند" لکھنے پر اکتفا کیا منشی محمد جعفر تھانیسری نے تو شاہ اسحاق کو سید صاحب کا مُرید ہی لکھ دیا[1]۔ ایک طرف شاہ اسحاق سید صاحب سے عمر میں چار سال بڑے تھے دوسری طرف وہ اپنے نانا شاہ عبدالعزیز سے بیعت اور ان کی خلافت سے سرفراز تھے اور اسی حیثیت کی بنا پر سید صاحب انہیں نذر پیش کیا کرتے تھے[2] بلکہ ایک روایت[3] یہ بھی ہے کہ سید صاحب نے شاہ اسحاق سے درس بھی لیا تھا۔

منشی محمد جعفر کے اتباع میں مولانا ابوالحسن علی نے سید صاحب سے شاہ اسحاق کے حصولِ فیض و تربیتِ باطن کا ذکر اپنی کتاب میں کر دیا۔ ایک غیر معتمد مولف پر اعتماد کر لیا۔

تحریکِ مجاہدین کے مورخین نے شاہ اسحاق کے تذکرے سے اعراض اور ان کو اپنے مقام سے فروتر دکھانے اور ان کی قدر و منزلت گھٹانے کی جو مسلسل و منظم مہم چلائی اس سے زیادہ مہلک اقدام اس گروہ کے علما نے کیا جسے اب بالعموم "وہابی" کہا جاتا ہے اور جو خود کو عامل بالحدیث، اہلِ حدیث اور سلفی اور اپنے مسلک کو عمل بالحدیث "تمسک بالکتاب والسنہ" رد بدعات و محدثات وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان حضرات نے شاہ اسحاق کی طرف دو کتابیں مسائل اربعین اور مأۃ مسائل منسوب کر دیں۔ ان کتابوں میں تشدد و تصلب پر مبنی فقہی نقطۂ نظر کو شاہ صاحب سے نسبت دے کر اپنے مسلک کی اشاعت کرنی چاہی۔

ہم نے شاہ صاحب کی تالیفات پر جو باب قائم کیا ہے اس میں بڑی تفصیل سے اور بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں کتابیں شاہ صاحب کی نہیں ہیں۔ یہاں مختصراً ان حضرات کی نشان دہی کرنا ہے جو اس کاروبار میں شریک تھے تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ کس نقطۂ نظر، کس اندازِ فکر اور کس عقیدے کے لوگ یہ "کارِ خیر" انجام دے رہے تھے۔

مسائل اربعین کے مرتب تھے مولوی ابو محمد، محمد امین جالیسری کے متعلق ان کے ایک ہم مشرب نے لکھا ہے۔

---

[1] سوانح احمدی ص۔ [2] شاہ ولی اللہ از مولانا عبید اللہ سندھی۔ [3] ارواحِ ثلاثہ ص ۱۵۷

..... سید پاک اور دین اسلام کے عقیدہ میں چست و چالاک ہیں۔ ساری بدعات سے تائب و بیزار اور خرافات سے دست بردار ہو کر پاک صاف مسلمان ہو گئے ہیں ....

اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ مولوی صاحب کس گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

کتاب کے مترجم ملا نظام شاہجہاں پوری :۔

کے بعض اساتذہ عامل بالحدیث اور ردِ بدعات سے مجتنب، یہی عمل ملا نظام کا تھا۔ لوگ انہیں "وہابی" کہتے تھے مگر وہ خود کو حنفی بتاتے تھے۔

دوسرے مترجم اور شارح مولوی سعد الدین عثمانی "ردِ بدعات میں بڑے غالی تھے"

وہ (مولانا فضل رسول بدایونی) مولوی سعد الدین کو اس قدر تنگ کرتے تھے کہ ایک بار ان کا سقا بھنگی تک بند کر دیا تھا۔ مگر مولوی سعد الدین اس پر بھی اپنی مساعی سے باز نہ آئے۔

شاہ اسحاق کی طرف دوسری منسوب کتاب مأۃ مسائل کے مرتب مولوی احمد اللہ نامی تھے۔ مسلکاً عامل بالحدیث تھے۔ مأۃ مسائل کا رد مولانا فضل رسول بدایونی نے تصحیح المسائل کے نام سے شائع کیا تو مولوی بشیر الدین قنوجی نے تصحیح المسائل کا رد تفہیم المسائل کے نام سے کیا۔ مولوی بشیر الدین قنوجی بھی مسلکاً اہلِ حدیث تھے۔

ظاہر ہے کہ اس مسلک کے علماء نے جو کتابیں تصنیف فرما کر شاہ اسحاق کے نام سے شائع کی ہوں گی انہیں شاہ اسحاق اور ان کے بزرگوں کے مسلک فقہی سے کیا نسبت ہو گی؟ اور جن لوگوں نے لاعلمی اور بے خبری کی بنا پر شاہ اسحاق کی طرف ان کتابوں کی نسبت کو صحیح سمجھا ہو گا انہوں نے شاہ اسحاق کے مسلک کے متعلق یقیناً یہ رائے قائم کی ہو گی کہ شاہ اسحاق بھی شاہ اسماعیل کی طرح اپنے نانا کے مسلک سے منحرف ہو گئے تھے۔ شاہ اسحاق کے ساتھ ناانصافی کرنے والوں کا تیسرا حلقہ بدایونی و بریلوی علماء کا گروہ ہے جس کے سرخیل مولانا فضل رسول عثمانی بدایونی تھے۔ مولانا فضل رسول نے شاہ اسحاق پر اپنے جو تاثرات ظاہر کئے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گروہ اہلِ حدیث اپنے مقاصد میں کامیاب رہا اور مسائل اربعین اور مأۃ مسائل کو شاہ اسحاق کی ہی تالیفات سمجھا جانے لگا اور مولانا فضل رسول نے اسی لَے میں لَے ملائی اور لکھا کہ مسائل اربعین اور مأۃ مسائل دراصل تقویۃ الایمان کے ترمیم

شدہ ایڈیشن میں اور شاہ اسماعیل و شاہ اسحاق میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ مولانا فضل رسول نے اپنے متعدد رسائل و کتب میں اپنے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ بوارق[1] میں انہوں نے برعظیم میں تاریخ تحریکِ وہابیت کا تجزیہ اس طرح کیا ہے۔ مولوی عبدالحی بڈھانوی اور شاہ اسمٰعیل نے سید صاحب کو اپنا مرشد بنا کر ایک تحریک شروع کی اور دَورے کر کے وعظ و تلقین کرتے تھے۔ دورۂ مرادآباد میں انہیں محمد بن عبدالوہاب نجدی کی کتاب التوحید ہاتھ آئی۔ کتاب التوحید کے انداز نے انہیں اپیل کیا۔ چنانچہ انہوں نے معمولی رد و بدل کے بعد اس کا اردو ایڈیشن تقویت الایمان کے نام سے شائع کیا جس پر علماء دہلی میں اضطراب پیدا ہو گیا اور ان کے خلاف رسائل و فتوی مرتب و شائع مناظرہ ہوا جس سے رفق و رخوت اور تقیہ و تاویل کا اسلوب ان حضرات نے اپنایا پھر سید صاحب اور شاہ اسماعیل کی وفات کے بعد اور بھی سرد پڑ گئی اور تقویت الایمان کی اشاعت روک دی گئی مگر مسائلِ اربعین اور مأۃ مسائل کے بارے میں تقویت کے مسائل جوں کے توں رہے۔ (یاد رہے کہ یہ دونوں کتابیں شاہ اسحاق کی طرف منسوب ہیں)

اپنی دوسری کتاب سیف الجبار[2] المسلول میں مولانا بدایونی تقویۃ الایمان اور اربعین و مأۃ کی اس ہم رنگی و یک سانی کی اس طرح تفصیل کی ہے۔

"جب مولوی اسحاق اس طریقہ کے امام بنے طریقۂ اسماعیلیہ سے بہت اختلاف کیا یعنی جن باتوں کو مولوی اسماعیل نے مطلقاً کفر و شرک لکھا مولوی اسحاق نے ان میں سے کسی کو مکروہ کسی کو مختلف فیہ لکھا کسی میں تفصیل کی۔

مولانا بدایونی نے یہ جو لکھا ہے کہ امہات مسائل کی حد تک تقویت مأۃ اور اربعین میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسپرٹ دونوں میں وہی ہے تو ہمیں اس سے اتفاق ہے اور یہ جو لکھا ہے کہ جو تھوڑا بہت فرق ہے اور تقویت کی شدت و غلظت کی جگہ ان دو رسالوں میں رفق و اخوت کا جو رنگ ہے وہ پالیسی کی تبدیلی کا نتیجہ ہے تو یہ بھی ہمارے خیال میں بالکل صحیح ہے مگر جہاں انہوں نے مأۃ و اربعین کو شاہ اسحاق کی تالیفات بیان کیا ہے اور

---

[1] البوارق المحمدیۃ برجم الشیاطین النجدیۃ ص۱۹ تا ص۲۲۔

[2] مطبوعہ مطبع غالب الاخبار (مطبع صبح صادق سیتاپور) ۱۲۹۲ھ ص۱۶۰۔

خود شاہ اسحاق کو شاہ اسماعیل کا ہم خیال تسلیم کیا ہے وہاں ہمیں ان سے اختلاف کرنا پڑتا ہے اور نہ صرف یہ کہ درحقیقت یہ کتابیں شاہ اسحاق کی تالیف نہیں ہیں بلکہ مولانا بدایونی کے بھی علم میں تھا کہ یہ ان کی تالیفات نہیں ہے اور ان کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں کیوں کہ مولانا بدایونی نے خود لکھا ہے[۱] کہ ۱۲۶۶ھ میں جب انہوں نے مأۃ مسائل کے جواب میں تصحیح المسائل لکھی تو اس کے بعد جو ایڈیشن شائع ہوا اس میں کئی جگہ تغیر و تبدل کیا گیا تھا ظاہر ہے کہ شاہ اسحاق نے تو یہ تغیر کیا نہیں تھا جو تصحیح المسائل کی اشاعت سے چار سال قبل ۱۲۶۲ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پا گئے تھے۔ لامحالہ یہ تغیر و تبدل انہیں حضرات نے کیا ہوگا جو در اصل اس کتاب کے مؤلف تھے۔ مگر مولانا بدایونی کو شاہ اسحاق سے کیا ہمدردی تھی کہ وہ ان کی طرف سے صفائی کرتے اور وہابیت کے خلاف اپنے مقدمہ کو اُلجھا لیتے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ وکیل کی حیثیت سے انہوں نے صحیح اقدام کیا لیکن افسوس ہے کہ تحقیق کا حق ادا نہیں کیا اور حق کوشی اور حقیقت پسندی کا ثبوت نہیں دیا۔ اور آج سوا سو سال بعد جب ہم ایک غیر جانب دار کی حیثیت سے اس مسئلہ کا جائزہ لینے بیٹھے ہیں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا بدایونی نے شاہ اسحاق کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ایک معاصر ہونے کی حیثیت سے ان کے علم میں تھا کہ :-

کتاب مأۃ مسائل مولف کتاب (مولوی احمد اللہ انامی) کے بیان کے مطابق ... ۱۲۳۵ھ میں مرتب ہوئی اور مسائل اربعین مولف کتاب (سید ابو محمد جالیسری) کے بیان کے مطابق ۱۲۵۵ھ میں مرتب ہوئی۔ مگر مسائل اربعین، شاہ اسحاق کے سفر ہجرت ۱۲۵۸ھ کے دو سال تین ماہ بعد صفر ۱۲۶۱ھ میں شائع ہوئی اور مأۃ مسائل اس کے بھی بعد یعنی شاہ صاحب کی وفات کے بھی بعد شائع ہوئی۔

دونوں کتابوں میں سے کسی کتاب پر، جیسا کہ اس قسم کی کتابوں کے سلسلہ میں رسم و روایت ہے شاہ محمد اسحاق کے دستخط نہیں ہیں۔

دستخط اور تحریر کی توثیق کے لئے مُہر کا رواج بھی عام ہے۔ مگر دونوں میں سے کسی

---

[۱] فیوض ارواح قدسی ص۱۷

کتاب میں بھی شاہ صاحب کی مہر نہیں ہے۔

کتابوں کے حقیقی مصنف اور بظاہر مرتب و مولف معاصر ہونے کی بنا پر اہلِ حدیث یا کم سے کم ایسے متشدد حنفی ہیں جو بدعت بدعت کی گردان کرنے کی بنا پر وہابی کہلاتے ہیں۔ اسی طرح کتابوں کے مترجم اور شارح بھی اس گروہ کے جانے پہچانے لوگ تھے خصوصاً مولوی سعدالدین عثمانی تو آپ کے ہم وطن (بدایونی) ہی تھے اور آپ انہی وہابیت کے جرم میں اُن کا سقا بھنگی بند کر چکے تھے۔ آپ نے مأۃ مسائل کے جواب میں جب تصحیح المسائل ۱۲۶۶ھ میں لکھی جب کہ شاہ اسحاق صاحب کے وصال کو چار سال ہو چکے تھے تو اس کے بعد حقیقی... مصنفِ کتاب نے دوسرے ایڈیشن میں ترمیم کر دی۔ یہ خود آپ ہی کا بیان ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے علم میں تھا کہ مأۃ مسائل کا حقیقی مصنف کون ہے؟ اس کے باوجود جب آپ یہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب شاہ اسحاق کی ہے تو ہم آپ کے قول کو قابلِ قبول تسلیم نہیں کر سکتے۔ مولانا بدایونی نے مأۃ و اربعین کو شاہ اسحاق کی کتابیں فرض کر کے ہی یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ شاہ اسماعیل کے بعد جماعت کے امام بنے[1]۔ مگر ہمیں ان کی کسی تحریر میں اس قول کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔ یہ تو مولانا نے بھی تسلیم کیا ہے[2] کہ

"بعد مرنے شاہ (عبدالعزیز) صاحب کے مولوی اسحاق ان کے جانشین و وارث ہوئے۔ وعظ و فتویٰ میں موافق سلف کے تھے اور مذہبِ اسماعیل کے مخالف تھے۔ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے فتوے موجود ہیں۔"

مگر شاہ اسحاق کے انقلابِ خیال کا کوئی ثبوت مولانا نے پیش نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ شاہ اسماعیل کے بعد طریقۂ اسماعیلیہ کے امام شاہ اسحاق بنائے گئے مگر اس سلسلہ میں انہوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ نہ ہمیں معاصر تاریخوں میں کہیں اس کا سراغ ملا۔ نہ شاہ اسحاق کے کسی ارادت مند اور شاگرد نے اس کا ذکر کیا۔ نہ شاہ اسماعیل کے ہم مسلک حضرات میں سے شاہ اسحاق کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو طریقہ کے امام کے ساتھ کیا جانا چاہئیے۔ اس کے برعکس جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں تحریک کے مورخین نے شاہ اسحاق کے ساتھ تحقیر اور عدم اعتنا کا معاملہ کیا اور سید

[1] فیوض ارواح قدسی صہ۱۔ [2] سیف الجبار صفحہ ۵۷، ۱۶۰۔

صاحب کی ضخیم سوانح عمریوں میں شاہ اسحاق کا نام ملتا ہے تو بس مریدین کی فہرست میں مخزنِ احمدی، منظورۃ السعداء سوانح احمدی، سیرت سید احمد شہیدؒ سب کا یہی حال ہے۔ غلام رسول مہر نے اپنی تین ضخیم مجلدات میں سے ایک (جماعتِ مجاہدین) میں ختم کتاب کے بعد ضمیمہ میں چار صفحے میں شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب دونوں بھائیوں کو ٹھکتا دیا ہے اور وہ بھی اس صراحت کے ساتھ کہ یہ دونوں چوں کہ سید صاحب کے ارادت مند تھے اس لئے اس کے مستحق تھے کہ ان کا تذکرہ ہو۔ مگر ہم بھول گئے اس لئے اب ضمیمہ میں ان کا تذکرہ کئے دیتے ہیں۔ تو یہ سب کچھ کیا ان کے امامِ طریقہ ہونے کا ثبوت ہے؟

اس سے ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شاہ اسحاق کے پہلے موافقِ سلف ہونے اور بعد میں "اسماعیلی" بلکہ طریقہ اسماعیلیہ کے امام ہو جانے کا کوئی ثبوت مولانا بدایونی کے پاس سوائے اس کے نہیں تھا کہ وہ ان دو کتابوں کو شاہ اسحاق کی تالیف فرض کر رہے تھے اور یہ واقعہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بھی واقعہ نہیں ہے کہ شاہ اسحاق سلف کے عقائد سے برگشتہ ہو گئے تھے اور سلفی ہو گئے تھے۔
اس تنقیحی جائزے کے بعد اب ہم مثبت طور پر شاہ محمد اسحاق کے مزاج و کردار اور مسلک و افکار کے متعلق کہتے ہیں۔

شاہ محمد اسحاق نے تعلیم کے مراحل اپنے ناناؤں (شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر) کے زیرِ سایہ طے کئے اور طریقت کے مراحل بھی انہیں دونوں بزرگوں نے طے کرائے اور سلسلۂ قادریہ میں شاہ عبدالعزیز سے بیعت کی اور اسی تعلیم و تربیت کے اثرات نے ان کے کردار کی تشکیل کی اور وہ بالآخر شاہ عبدالعزیز کے جانشین منتخب ہوئے اور اپنے مدۃ العمر کے طرزِ فکر و عمل سے اس انتخاب صحت کا ثبوت دیا۔

ان کا فقہی و اصولی مسلک شاہ عبدالعزیز کا مسلک تھا اور وہ پورے پورے حنفی تھے اور ہر اس فرد اس کتاب اور اس تحریک کے مخالف تھے جو حنفیت اور تقلید کے خلاف ہو۔ اسی لئے وہ شاہ اسماعیل شہید کی تحریک عدم تقلید کے سخت خلاف تھے۔ قائلینِ عدم تقلید کو "لا مذہب" فرمایا کرتے تھے۔ ان کے تلمیذ رشید اور خلیفہ نواب مولوی قطب الدین خاں دہلوی لکھتے ہیں[1]

[1] توفیر الحق ص۳ طبع لاہور۔

اور چند سال گزرے ہیں میں نے بچشم خود دیکھا تھا کہ مولانا و اولانا و مرشدنا و استاذنا خاتم المحدثین مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے طعن کرنے والوں پر خفا ہوتے تھے کہ رنگ آپ کا سرخ ہوجاتا تھا اور فرماتے تھے کہ بدون تقلید مذہب ایک امام کے کوئی بنتی ہی نہیں ہوتا ہے اور آپ حنفی المذہب تھے۔

نواب صاحب[1] کا بیان ہے کہ شاہ صاحب غیر مقلدین کو ضال و مضل فرماتے تھے۔

نواب صاحب نے اپنی دوسری کتاب تحفۃ العرب والعجم میں لکھا ہے۔

اس وقت جناب مولانا محمد اسحاق صاحب مرحوم اور مولوی محبوب علی صاحب مرحوم اور مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم دہلی میں موجود تھے اور یہ صاحب ایسے لوگوں سے بہت ناراض رہتے تھے اور ان کے کلمات سن کر چہرۂ مبارک حضرت مولانا محمد اسحاق کا سرخ ہوجاتا تھا اور فرماتے تھے کہ یہ لوگ ضال ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

آخر مجبور ہو کر (احناف نے) سن ایک ہزار دو سو چون میں ایک استفتا مولانا محمد اسحاق صاحب نواسہ و جانشین حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے روبرو پیش کیا۔ انہوں نے اس کے جواب میں تقلید امام معین کو واجب تحریر کیا اور اس کے منکر کو ضال تحریر فرمایا۔ پھر اس فتوے پر دیگر علماء شہر نے بھی کچھ کچھ عبارتیں لکھ کر مہریں لگائیں۔

اب شاہ صاحب کا وہ فتویٰ ملاحظہ فرمائیے جس کا ذکر مندرجہ بالا عبارت میں آیا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:[2]

درکتاب اشباہ می نویسد اذا سئلنا عن مذھبنا	کتاب الاشباہ والنظائر میں لکھا ہے کہ
ومذھب مخالفینا فی الفروع یجب علینا	جب ہم سے ہمارے مذہب اور ہمارے
ان نجیب بان مذھبنا صواب یحتمل الخطا	مخالفوں کے فروع (جزئیات) کے بارے
ومذھب مخالفینا خطاء یحتمل الصواب	میں پوچھا جائے تو ہمارا جواب یہ ہونا چاہیے کہ
انتھیٰ وقتے کہ کسے مذہب حنفی اختیار کرد لازم	ہمارا مذہب صواب ہے (بے خطا) اور اس میں
ست کہ ترجیح خواہد داد و چوں ترجیح مذہب خود	خطا (صحیح نہ ہونے) کا احتمال ہے اور مخالفین

[1] تو قیر الحق، طبع لاہور ص ۹۔ [2] تنبیہ الضالین ص ۳۵، ۳۴ مطبع خورشید عالم لاہور۔

را مرجوح خواہد دانست و مذہب اربعہ را مرجوح نبا ید دانست اتباع ایشاں اتباع کتاب و سنت باید دانست و کسے کہ امتیاز ندارد در میان احادیث کہ صحیح است یا غیر صحیح پس برد لازم ست کہ اتباع علماء نماید و کسے حقیقت مذہب اربعہ نداند و انکار اتباع ایشاں کند آں ضال ست واللہ اعلم۔ مہر محمد اسحاق

کا مذہب خطا (صحیح نہیں) ہے اور اس میں صواب (صحیح ہونے) کا احتمال ہے۔ جب کسی نے مذہب حنفی اختیار کر لیا تو یقیناً وہ ترجیح دے گا اور جب اس نے اپنے مذہب کو ترجیح دی تو غیر مذہب کو مرجوح سمجھے گا مگر چاروں (فقہی) مذاہب کو مرجوح نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ ان (میں سے کسی ایک) کی پیروی کو کتاب و سنت کی پیروی جاننا چاہیئے اور جو شخص صحیح اور غیر صحیح احادیث میں امتیاز نہیں کر سکتا اس پر لازم ہے کہ علماء (حق) کی پیروی کرے اور جو کوئی مذاہبِ اربعہ کو حق نہ سمجھے اور ان کی پیروی کا انکار کرے وہ ضال ہے۔ اور اللہ بہتر جانتا ہے۔ مہر (محمد اسحاق)

یہاں یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ شاہ صاحب نے یہ فتویٰ ۱۲۵۴ھ میں تحریر فرمایا تھا جس کے ایک سال بعد ۱۲۴۵ھ میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مأۃ مسائل لکھی۔ (کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے؟)

نواب صاحب کی ہی زبانی شاہ صاحب کے طریقِ درس اور حمایتِ احناف کا حال بھی سُن لیجیئے۔ لکھتے ہیں [1]

"ہم نے دیکھا جناب مولانا محمد اسحاق صاحب علیہ الرحمۃ کو وقت پڑھانے حدیث کے جہاں تعارضِ حدیث اور روایتِ فقہی میں ہوتا اس وقت حدیث متمسکِ حنفیہ کی بیان فرما کر دفعِ تعارض کر دیا کہ پڑھنے والے کو تسکین ہو گئی اور سوءِ ظنی بہ نسبت مذہب (فقہی) کے نہ ہونے پائی بلکہ حقیقتِ مذہب اپنے دل میں خوب جم گئی"

شاہ صاحب کے معتبر، معتمد اور سعید تلامذہ کے ان اقوال و بیانات اور خود شاہ صاحب کے اس فتوے کے بعد شاہ صاحب کی صحتِ عقائد اور حنفیت میں ان کے رسوم کے متعلق کوئی شبہ باقی نہیں رہتا اور شاہ اسماعیل سے کسی قسم کے اتحاد و اتفاق

---

[1] تحفۃ العرب والعجم تالیف ۱۲۸۴ھ طبع ۱۲۸۵ھ مطبع حسنی دہلی ص۱۱۔

فکر و نظر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس شاہ اسماعیل سے اُن کے خوش گوار روابط کا کوئی ذکر کسی نے نہیں کیا۔ اختلافِ نظریات کی بنا پر جادۂ و منزل کا اختلاف بے شک نمایاں ہے۔ مثلاً سید صاحب ایک پورے قافلہ کے ساتھ سفرِ حج کے لئے گئے تھے۔ اس قافلہ میں خاص اُن کے گھرانے کے بہت سے افراد شریک تھے۔ اس دَور میں ایسے دور و دراز کے سفر میں اقامت و سفر ہی کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ پھر اعزا کی رفاقت!

مگر شاہ اسحاق اس قافلہ میں شریک نہیں ہوئے اور اس قافلہ کی مراجعت کے صرف چند ماہ کے بعد عازمِ سفر ہوئے۔

راہوں کے اختلاف کا ایک اور پہلو اس سے بھی نمایاں ہوتا ظاہر ہوتا ہے۔ پہلے کاروانِ حج کے دو اہم مسافر شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحئی نے اپنے سفرِ حج میں قاضی محمد بن علی الشوکانی سے سندِ حدیث حاصل کی تھی۔ ان کے معاً بعد شاہ اسحاق بھی حجاز پہنچے مگر انہوں قاضی الشوکانی سے نہیں شیخ عمر بن عبدالکریم سے سند حاصل کی۔ یہ اختلاف صرف اشخاص و افراد کا اختلاف نہیں ہے، مکاتیبِ فکر و خیال کا اختلاف ہے۔

شیخ عمر نے خود کو حنفی لکھا ہے۔ وہ وطناً بھی حجازی تھے۔ نجدی نہیں تھے۔ قاضی شوکانی نجدی نہیں یمنی تھے۔ وہ مسلکاً بھی حنفی نہیں تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے انہیں زیدی بتایا ہے۔ پھر یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ شاہ اسحاق ابھی حجاز ہی میں تھے کہ سید صاحب اور شاہ اسماعیل اپنے قافلۂ مجاہدین کو لے کر سرحد کی طرف روانہ ہو گئے تھے اور ان کی مراجعت کا انتظار نہیں کیا تھا۔ کیا یہ سب باتیں اس ذہنی بُعد اور مزاج و مسلک کے اختلاف کی نشان دہی نہیں کرتیں جو شاہ اسماعیل اور شاہ اسحاق میں تھا؟

اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ شاہ اسحاق معلوم ہوتا ہے کہ فطرتاً تحریر و کتابت کے مردِ میدان نہیں تھے۔ وہ مسندِ درس کو زینت دینے کے لئے بنائے گئے تھے اور عمر بھر بھی مسندِ درس ہی سے چسپاں رہے۔ لوح و قلم کی آویزشوں کے لئے نہ وہ وقت نکال سکے، نہ انہیں اس سے فطری مناسبت تھی۔ مختصر یہ کہ وہ قلم کار نہیں تھے اس لئے علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا رشید الدین خاں اور دوسرے معاصرین کی طرح اِس فتنہ کے انسداد کے لئے

قلم کو حرکت میں نہیں لاسکے اور قائلینِ عدمِ تقلید کے رد میں وہ خود کوئی رسالہ یا کتاب نہ لکھ سکے، ہاں اُن کے تلامذہ خصوصاً قاری عبدالرحمٰن پانی پتی اور نواب قطب الدین خاں نے ان کی کوتاہ قلمی کی خوب تلافی کردی۔

تقسیمِ کار کے اصول کے تحت شاہ اسحاق نے جو کام اپنے ذمہ لیا تھا کوئی بھی ہوش مند اس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کرسکتا فتنۂ عدمِ تقلید کے انسداد کی ایک بڑی موثر و مفید تدبیر شاہ اسحاق نے یہ کی کہ صحیح العقائد اور سلیم الفکر علماء کی جماعت ڈھالتے رہے اور اُسے پورے ملک میں بکھیرتے رہے تاکہ وہ ہر محاذ پر ہر گوشہ میں قائلینِ عدمِ تقلید سے نپٹتے رہیں اور بر سرِ زمین بھی ان کا رد کرتے رہیں۔ یہ کام دیر طلب اور حوصلہ آزما سہی مگر اس کے نتائج و ثمرات کی گہرائی ناقابلِ انکار ہے۔

آپ صفحاتِ ماسبق میں پڑھ چکے ہیں کہ وہ فجر سے عشاء تک معمولی وقفوں کے سوا مسلسل درس وافادہ میں منہمک رہتے تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ایک فرد کی حیثیت سے گروہِ مخالف سے نبرد آزما ہونے کے بجائے بہتر اور مفید تر یہی ہے کہ وہ فرد، فرد نہ رہے جماعت بن جائے۔ چنانچہ شاہ اسحاق یہ جماعت بناتے رہے اور غیر مقلدین کے خلاف انہوں نے ایک ایسی فوج تیار کردی جو صرف دہلی میں نہیں بلکہ ملک کے ہر حصہ میں پہنچ کر اُن کو للکارتی رہی اور مسند درس، میدانِ مناظرہ، بزم لوح و قلم غرض ہر محاذ پر ان حضرات کے رد و ابطال اور اس فتنہ کے استیصال میں سرگرم رہی۔

شاہ اسحاق نے تحریکِ جہاد میں جس حد تک حصہ لیا اس پر ہم ایک مستقل فصل میں گفتگو کرچکے ہیں۔ مولانا فضل رسول بدایونی کی نظر میں شاہ اسحاق کی وہابیت میں اس "جرم" کو بھی دخل ہے حالانکہ بات صاف اور سادہ ہے۔ جہاں تک شاہ اسماعیل کے مزاج کی شدت، اُن کے غیر حکیمانہ اندازِ دعوت اور ترکِ تقلید کی تبلیغ کا تعلق ہے اس سے شاہ اسحاق کو شدید اختلاف تھا۔ مگر جہاں تک دعوتِ جہاد کا تعلق ہے تو مرتبہ اطلاق میں اس سے اختلاف کا کیا جواز تھا اور جہاد میں کسی نہ کسی طرح کی شرکت میں تذبذب کا کیا محل تھا؟ چنانچہ شاہ اسحاق نے جو اختلاف کو اختلاف کی حد تک رکھنے اور اتفاق کی بات میں اتفاق کرلینے کے قائل تھے۔ مجاہدین کی بقدرِ استطاعت اعانت کی۔ (جس کی تفصیل ہم "اعانتِ مجاہدین" کے عنوان سے ایک فصل میں کرچکے ہیں)

ماخذ و مصادر

۱۔ نزہۃ الخواطر الجزء السابع ۔ مولانا عبدالحئی حسنی ۔ حیدر آباد دکن ۱۹۵۹ء

۲۔ " " " الجزء الثامن " " " ۱۹۷۰ء

۳۔ النفحۃ الدہلویہ ۔ مولوی عبدالوہاب دہلوی (علی جان والے) در مقدمہ المسوی شرح موطا ۔ الجزء الاول طبع مکہ معظمہ ۱۳۵۱ھ

۴۔ مأۃ مسائل ۔ طبع نہم نول کشور کانپور ۱۹۱۳ء

۵۔ الرسالۃ الوضیہ فی النصیحۃ والوصیۃ (وصیت نامہ) شاہ ولی اللہ ۔ مطبع احمدی ہوگلی (بنگال) سن ندارد

۶۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز ۔ مطبع مجتبائی میرٹھ ۱۳۱۴ھ

۷۔ ارواحِ ثلاثہ (حکایاتِ اولیا) یونین پریس دہلی ۔ طبع کراچی

۸۔ فتاویٰ عزیزی ۔ شاہ عبدالعزیز ۔ مرتبہ مرزا محمد بیگ دہلوی ۔ مطبع مجتبائی دہلی

۹۔ لال قلعہ کی ایک جھلک ۔ خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی ۔ ساقی بک ڈپو دہلی

۱۰۔ انفاس العارفین ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی ۔ مطبع احمدی ۔ سن ندارد

۱۱۔ حیات سید احمد شہید (سوانح احمدی) محمد جعفر تھانیسری ۔ طبع کراچی ۱۹۶۸ء

۱۲۔ آثار الصنادید ۔ سر سید احمد خاں ۔ طبع کراچی ۱۹۶۶ء ۔ مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق

۱۳۔ جماعتِ مجاہدین ۔ غلام رسول مہر ۔ طبع لاہور ۱۹۵۵ء

۱۴۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ۔ مولانا عبیداللہ سندھی ۔ طبع لاہور ۱۹۷۰ء

۱۵۔ واقعات دارالحکومت دہلی ۔ حصہ دوم ۔ بشیر الدین احمد ۱۹۱۹ء

۱۶۔ مجموعۂ حالات و کرامات عزیزی ۔ حصہ اول ۔ سید احمد ولی اللہی ۔ دہلی ۱۳۴۸ھ

۱۷۔ تراجم علماءِ حدیث ۔ یحییٰ خاں نوشہروی ۔ دہلی ۱۹۳۸ء

۱۸۔ شمائم امدادیہ ۔ مرتبہ مولانا اشرف علی تھانوی

۱۹۔ سرگذشتِ مجاہدین ۔ غلام رسول مہر ۔ طبع لاہور ۱۹۵۵ء

۲۰۔ الحیات بعد الممات ۔ فضل حسین بہاری ۔ طبع کراچی ۱۹۵۹ء

۲۱۔مسائلِ اربعین مطبع محمدی دہلی ۱۲۶۱ھ
۲۲۔الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی از محمد محسن الترہتی۔جید برقی پریس دہلی ۱۳۴۹ھ
۲۳۔شاہ محمد محدث دہلوی۔شاہ ولی اللہ کے پانچویں فرزند۔محمود احمد برکاتی۔رسالہ فاران جون ۱۹۶۵ء کراچی
۲۴۔مقالاتِ طریقت معروف بہ فضائلِ عزیزی۔عبدالرحیم ضیا۔طبع ۱۲۹۲ھ تالیف ۱۲۹۱ھ مطبع متن کرنال
۲۵۔مخزن احمدی از سید محمد علی رائے بریلوی۔۱۲۹۹ھ مفید عام آگرہ
۲۶۔گلشن ہمیشہ بہار۔نصر اللہ خاں۔مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی۔انجمن ترقی اردو کراچی
۲۷۔مکتوب شاہ اسماعیل شہید۔مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۱ء
۲۸۔منظورۃ السعدا فی احوال الغزاۃ والشہدا۔جعفر علی نقوی۔مولفہ ۱۲۷۶ھ مخطوطہ
۲۹۔(کتب خانہ سعیدیہ ٹونک)
الفوز الکبیر۔شاہ ولی اللہ۔مطبع احمدی ہوگلی (بنگال) ۱۲۴۹ھ
۳۰۔فتاویٰ ابن تیمیہ۔طبع مصر
۳۱۔مکتوبات (شاہ ولی اللہ) مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۴ھ
۳۲۔محمد بن عبدالوہاب۔مسعود عالم ندوی ۱۹۴۹ء مطبع کراچی
۳۳۔الخیر الکثیر۔شاہ ولی اللہ۔ڈابھیل ۱۹۳۵ء
۳۴۔شاہ ولی اللہ کا فقہی مسلک المسوی والمصفیٰ کی روشنی میں۔ڈاکٹر محمد مظہر بقا حیدرآباد سندھ
۳۵۔استدراک (بر "سیاسی مسلک" از مولانا سندھی) مسعود عالم ندوی
ماہنامہ معارف اعظم گڑھ۔شمارہ ۳ جلد ۵۱ فروری ہمئی ۱۹۴۳ء
۳۶۔حجۃ اللہ البالغہ۔شاہ ولی اللہ۔ مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۶ھ
۳۷۔فیوض الحرمین " مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۸ھ
۳۸۔حیات ولی۔رحیم بخش دہلی ۱۳۱۹ھ
۳۹۔اہلِ حدیث کی علمی خدمات۔یحییٰ خاں نوشہروی۔الرحیم اکتوبر و نومبر ۱۹۶۵ء
۴۰۔رسالہ اصول مذہب حنفیہ (در فتاویٰ عزیزی ص ۲۶) شاہ عبدالعزیز
۴۱۔رسالہ کیفیت اختلاف مذاہب اربعہ مشمولہ فتاویٰ عزیزی ص ۱۳۶۔شاہ عبدالعزیز

۴۲۔ مایجب حفظہ للناظر۔ شاہ عبدالعزیز۔ مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۷ھ

۴۳۔ تحفہ اثنا عشریہ۔ شاہ عبدالعزیز۔ طبع کراچی

۴۴۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء۔ شاہ ولی اللہ۔ مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۶ھ

۴۵۔ تنبیہ الضالین وہدایت الصالحین۔ مطبع خورشید عالم لاہور۔ سن ندارد

۴۶۔ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند۔ سید عبدالحئی حسنی۔ طبع دمشق ۱۳۵۸ھ

۴۷۔ تنویر العینین۔ شاہ اسماعیل شہید۔ طبع نظامی لدھیانہ ۱۲۷۹ھ

۴۸۔ البوارق المحمدیہ لرجم الشیاطین النجدیہ۔ مولانا فضل رسول بدایونی ۱۲۶۵ھ

۴۹۔ شاہ ولی اللہ کے حالات شاہ عبدالعزیز کی زبانی۔ محمود احمد برکاتی۔ اقبال ریویو کراچی

۵۰۔ الاوائل۔ مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۷ھ

۵۱۔ کشف الحجاب۔ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی۔ لکھنؤ۔ مع مقدمہ از محمود احمد برکاتی۔ کراچی ۱۹۸۱ء

۵۲۔ توقیر الحق۔ نواب مولوی قطب الدین خاں۔ مطبع خورشید عالم لاہور۔ سن ندارد

۵۳۔ نظام تعلیم و تربیت حصہ دوم۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ۱۹۴۳ء۔ ندوۃ المصنفین دہلی

۵۴۔ دہلی اور اس کے اطراف۔ عبدالحئی حسنی دہلی ۱۹۵۸ء

۵۵۔ تذکرہ صادقہ۔ عبدالرحیم صادق پوری۔ طبع ۱۳۲۰ھ

۵۶۔ تازہ نوائے معارک۔ تالیف عطار حسین۔ مرتبہ آغائے عبدالحئی کراچی ۱۹۵۹ء

۵۷۔ مومن از کلب علی خاں فائق۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۱ء

۵۸۔ حالات مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ از مولانا محمد یعقوب نانوتوی۔ طبع بہاول پور ۱۲۹۷ھ

۵۹۔ مرقاۃ الیقین فی حیاۃ نور الدین۔ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ مجلس احمدیہ لاہور

۶۰۔ ارشادِ مرشد۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی۔ نظامی کانپور ۱۲۹۴ھ

۶۱۔ تذکرہ علمائے ہند۔ مولوی رحمٰن علی۔ لکھنؤ ۱۹۱۴ء

۶۲۔ ترجمہ تذکرہ علمائے ہند۔ پروفیسر محمد ایوب قادری۔ کراچی ۱۹۶۱ء

۶۳۔ حدائق الحنفیہ۔ فقیر محمد جہلمی ۱۹۰۶ء لکھنؤ

۶۴۔ مولانا محمد احسن نانوتوی۔ پروفیسر محمد ایوب قادری کراچی ۱۹۶۶ء

۶۵۔ سیرتِ والاجاہی حصہ اول

۶۶۔ سیارہ ڈائجسٹ لاہور۔ مضمون مائل نقوی۔ ایک مسلمان وزیر۔ فروری ۱۹۷۱ء

۶۷۔ تذکرہ فضل الرحمٰن۔ مولانا ابوالحسن ندوی ۱۹۵۸ء

۶۸۔ حیاتِ جاوید۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ آگرہ ۱۹۰۳ء

۶۹۔ حیاتِ وحید الزماں۔ مولانا عبدالحلیم چشتی کراچی ۱۹۵۸ء

۷۰۔ حیوٰۃ العلماء از مولوی عبدالباقی سہسوانی ۱۹۲۳ء

۷۱۔ خزینۃ الاصفیا۔ فقیر محمد جہلمی ۱۹۱۴ء لکھنؤ

۷۲۔ سیرتِ فریدیہ۔ سرسید۔ محمود احمد برکاتی کراچی ۱۹۶۴ء

۷۳۔ تحقیق وحدۃ الوجود والشہود۔ ثناء الحق صدیقی ایم۔ اے علیگ۔ کراچی ۱۹۶۳ء

۷۴۔ اتحاف النبیہ فی ما یحتاج الیہ المحدث والفقیہ شاہ ولی اللہ۔ مرتبہ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی۔ لاہور ۱۹۶۹ء

۷۵۔ مظاہر حق جلد اوّل یا پنجم ۱۹۳۲ء۔ نول کشور لکھنؤ

۷۶۔ حیاتِ شبلی۔ حصہ اول۔ علامہ سید سلیمان ندوی ۱۹۴۳ء

۷۷۔ تصحیح المسائل۔ مولفہ مولانا فضل رسول بدایونی۔ مرتبہ فیض احمد بدایونی ۱۲۶۶ء

۷۸۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ خلیق احمد نظامی، دہلی ۱۹۶۹ء

۷۹۔ تذکرۂ غوثیہ۔ مرتبہ مولانا گل حسن شاہ۔ اشاعت ہفتم ۱۹۵۲ء لاہور

۸۰۔ سیف الجبار المسلول علی اعداء الابرار۔ مولانا فضل رسول عثمانی بدایونی

۸۱۔ مقالاتِ طریقت معروف بہ فضائل عزیزی۔ تالیف ۱۲۹۱ھ۔ مطبع تین کرتان ۱۲۹۲ھ حیدر آباد دکن۔ تالیف عبدالرحیم ضیا

۸۲۔ حیاتِ ولی۔ ابو محمد رحیم بخش دہلوی۔ افضل المطابع دہلی ۱۳۱۹ھ

۸۳۔ انفاس العارفین۔ شاہ ولی اللہ۔ مطبع احمدی دہلی۔ سن ندارد

۸۴۔ ارشاد محمدی۔ شیخ محمد محدث تھانوی۔ محبوب المطابع میرٹھ ۱۳۰۸ھ

۸۵۔ مکاتیب سید احمد شہید۔ مکتبہ رشیدیہ لاہور ۱۹۷۵ء

۸۶۔ مقالاتِ سرسید۔ حصہ نہم۔ ترقی ادب لاہور ۱۹۶۲ء

۸۷۔ تذکرۃ الرشید۔ مولفہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ تالیف ۱۳۲۶ھ بار دوم دہلی

۸۸۔ مقالاتِ شروانی۔ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ علی گڑھ ۱۹۴۶ء

تمّتِ المآخذ والمصادر و تمّ الکتاب

فہرست مطبوعات شاہ ابوالخیر اکاڈمی

۱- مقاماتِ اخیار (فارسی)	سائز ۲۰×۲۶/۸	۵۹۲ صفحات	آفسٹ	۷۵ روپے
۲- مقاماتِ خیر (طبع جدید)	۲۰×۲۶/۸	۸۰۰ ″	″	۷۵ روپے
۳- سوانح بے بہائے امام اعظم ابو حنیفہؒ	۲۰×۲۶/۸	۳۸۴ ″	″	۶۰ روپے
۴- مقاماتِ خیر (طبع قدیم)	۱۸×۲۲/۸	۸۰۰ ″	″	۵۰ روپے
۵- القول الجلی (فارسی)	۲۰×۲۶/۸	۵۶۰ ″	″	۴۰ روپے
۶- حضرت مجدد اور ان کے ناقدین	۱۸×۲۲/۸	۲۵۶ ″	″	۲۵ روپے
۷- تاریخ القرآن	۱۸×۲۲/۸	۱۴۴ ″	″	۲۰ روپے
۸- مجموعۂ خیر البیان	۱۸×۲۲/۸	۱۷۶ ″	″	۲۰ روپے
۹- حیات شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ	۱۸ ۲۲/۸	۱۶۰ ″	″	۲۰ روپے
۱۰- بزمِ خیر از زید در جواب بزم جمشید	۱۸×۲۲/۸	۱۶۰ ″	″	۱۵ روپے
۱۱- علامہ ابن تیمیہ اور ان کے ہمعصر علماء	۱۸×۲۲/۸	۱۳۲ ″	″	۱۵ روپے
۱۲- زیارتِ خیر الانام ترجمہ شفاء السقام	۱۸×۲۲/۸	۱۷۶ ″	″	۱۵ روپے
۱۳- مولانا اسماعیل اور تقویۃ الایمان	۱۸×۲۲/۸	۱۲۰ ″	″	۱۵ روپے
۱۴- مدارج الخیر بیان طریقہ نقشبندیہ مجددیہ	۱۸×۲۲/۸	۱۲۸ ″	″	۱۵ روپے
۱۵- مسئلہ ضبطِ ولادت	۱۸×۲۲/۸	۸۴ ″	″	۱۵ روپے
۱۶- وحدۃ الوجود اور بیان وحدۃ الشہود	۱۸×۲۲/۸	۸۳ ″	″	۱۵ روپے
۱۷- المجموعۃ السنیۃ در ردِ روافض	۱۸×۲۲/۸	۹۶ ″	″	۱۵ روپے
۱۸- غناء و سماعِ اصفیا	۱۸×۲۲/۸	۴۸ ″	″	۱۵ روپے
۱۹- معمولاتِ خیر	۲۰×۳۰/۱۶	۱۲۸ ″	″	۱۰ روپے
۲۰- عرفانیاتِ باقی	۱۸×۲۲/۸	۱۶۸ ″	″	۱۰ روپے
۲۱- سہ رسائل معرفت افزا	۱۸×۲۲/۸	۴۸ ″	″	۱۰ روپے
۲۲- ہندوستانی قدیم مذاہب اور حضرت میرزا مظہرؒ	۱۸×۲۲/۸	۷۲ ″	″	۱۰ روپے
۲۳- بیانِ خیر البشر	۱۸×۲۲/۸	۱۰۴ ″	″	۱۰ روپے
۲۴- فیصلہ ہفت مسئلہ	۲۰×۳۰/۱۶	۸۰ ″	″	۶ روپے
۲۵- مونس الارواح (جہاں آرا دختر شاہجہاں کا رسالہ مشائخ چشتیہ کے حال میں)		۱۰۴ ″	″	۶ روپے
۲۶- خیر المقال فی اثبات رویۃ الہلال	۲۰×۳۰/۱۶	۲۸ ″	″	۶ روپے
۲۷- سوانح حیات سید عارفین شاہ بلاقؒ	۱۸×۲۲/۸	۷۲ ″	″	۳ روپے
۲۸- القولِ الجلی کا مقدمہ اور اختتامیہ	۱۸×۲۲/۸	۶۴ ″	″	۳ روپے
۲۹- منہج الابرار فی الصلاۃ علی الانبیاء والرضا عن الاولیاء	۲۰×۳۰/۸	۱۶ ″	″	۳ روپے

شاہ ابوالخیر اکاڈمی، شاہ ابوالخیر مارگ، دہلی ۶